Registered No. L. 5340

جلد ۳۲

عدد ۵

ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ:

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۱۰۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۴/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۰/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	(زیر طبع)
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-	دین حق	-/۶/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	ایک اہم استفتا	/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	/۱۴/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
تفہیمات	۳/۸	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ	فی -/۶/-
حقیقت توحید	۱/۲	حقیقت شرک	۲/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-		

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

اشارات

قاعدے کی بات ہے کہ انسانی زندگی کی اجتماعی سرگرمیاں جتنی اہم اور جتنی وسیع الاثر ہوتی ہیں، ان میں شیاطین جن و انس کی دخل اندازیاں بھی اتنی بڑھ جاتی ہیں۔ چنانچہ انتخابات جو کسی قوم کی قیادت کا فیصلہ کرنے کے لئے منعقد ہوتے ہیں، ان میں ارواح معصیت ایڑی چوٹی کا زور لگا کے کام کرتی ہیں، تاکہ سیاست و تمدن کی باگ ڈور اربابِ فسق و فجور کے قبضے میں آجائے اور ابلیس اور اس کے لشکر کو انسانی زندگی کے بگاڑنے میں زیادہ مشغولیت کی ضرورت ہی نہ رہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی انتخابات منعقد ہوتے ہیں، وہاں غیبت اور بدزبانی، بہتان تراشی اور بدگمانی، سازباز اور جوڑ توڑ، مار دھاڑ اور غنڈہ گردی، ضمیروں کی سوداگری اور ایمان کی تجارت، جاہلی عصبیتوں کی اکساہٹ اور جاہ طلبی کی لعنت کے طوفان اٹھانے کے لئے بے پناہ شیطانی قوتیں میدان میں اتر آتی ہیں۔ معصیت کے لاؤ لشکر فضا کو مکدر کرنے، ذہنی انتشار پیدا کرنے، کینہ جذبات کو اکسانے، شعور کو معطل کرنے، قوت فیصلہ کو ماؤف کرنے، ہنگامہ آرائی اور تصادم بپا کرنے کے لئے ہر ممکن العمل تدبیر کو استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کے آئندہ انتخابات میں بھی حسب سابق یہ سب کچھ ہوگا اور وہی نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے گا جس کا چیلنج شر و فساد کے سپہ سالار نے ان الفاظ میں دیا تھا کہ :-

لاٰتینّھم من بین ایدیھم ومن	میں (حملہ کرنے کے لئے) ان (انسانوں) کے سامنے
خلفھم وعن ایمانھم وعن	سے آؤں گا اور ان کے پیچھے سے آؤں گا اور ان کے
شمآئلھم	دائیں پہلو سے آؤں گا اور ان کے بائیں پہلو سے آؤنگا۔

ان احوال کا اندازہ کرتے ہوئے ہمارے بعض خیر خواہ اب تک ہمیں یہی مشورہ دیتے رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کو انتخابات کے طوفانِ معصیت سے کنارہ کش رہتے ہوئے سردست ساحل پر کسی گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہو کے پڑے رہنا چاہیئے۔ لوگ جب یہاں دنیا پرستانہ سیاست کے شاہ زور سمند کے ساتھ جولانیاں دکھائیں گے اور ان کے راہوارِ اغراض کے سموں سے جب غیر اسلامی اخلاق کی گرد اڑے گی تو صالحین کے لئے ایک طرف اس

فضا میں سانس لینا مشکل ہوگا اور دوسری طرف آنکھیں کھول کر اسلامی اخلاق کے نشاناتِ راہ کو پہچاننے میں اور اس پر مستقیم رہنے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔

فی الواقع یہ آزمائش کوئی ہلکی آزمائش نہیں ہے کہ ایک طرف سے جائز و ناجائز کا سوال سامنے رکھے بغیر ہر تدبیر استعمال کی جا رہی ہو، لیکن دوسری طرف جائز حدود سے قدم باہر نکالنا اپنے مقصد کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنے کی حیثیت رکھتا ہو۔ عام حالات میں اخلاق کا پابند رہنا ہر بھلے آدمی کا شیوہ ہوتا ہے، لیکن بد اخلاقی کے طوفان میں گھر کر اعلیٰ اخلاقی قدروں پر ڈٹ کے کھڑے رہنا تقوے کا وہ بلند ترین مقام ہے جسے حاصل کرنے میں انبیا کے تربیت یافتہ صحابہ کو بھی دیر لگی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اقامتِ دین کی راہ میں باطل کی اشتعال انگیزیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جب "کفوا ایدیکم" کے نازک مراحل آتے ہیں تو عنانِ جذبات کو قابو میں رکھنا انتہا صبر آزما ہوتا ہے۔ راہِ حق میں یہ گھاٹی ایک مشکل ترین گھاٹی ہوتی ہے کہ شیاطین جن و انس برائی کا جواب برائی سے دینے کے لئے پیہم اکسا رہے ہوں اور ہر پہلو سے آ آ کے ٹھونکے لگا رہے ہوں، عزتِ نفس کا غلط احساس دلا رہے ہوں، انتقامی حسیات کو چونکا رہے ہوں، حمیتِ جاہلیہ کو اشتعال دلا رہے ہوں، مخالفین کو دنداں شکن جواب دینے کے لئے لغت میں سے تلخ ترین زہریلے کلمات کو چھانٹ چھانٹ کر اور ان سے سینہ زور جملے بنا بنا کر قوتِ نطق کے سامنے آراستہ کر رہے ہوں، حریف کو شکست دینے کے لئے کامیاب چالیں اور اسکیمیں سوچ سوچ کے دماغوں کو فراہم کر رہے ہوں اور پھر ان کے استعمال کے لئے مرعوب کن دلائل جواز بھی گھڑ گھڑ کے لا رہے ہوں تو ایسے لمحے میں "صبر جمیل" کے موقف پر قدم جمائے کھڑے رہنا فوزِ عظیم ہے۔ عین حالتِ جنگ میں حرام اور مکروہ ذرائع کے بھرے ہوئے ترکش قبضے میں ہوں اور پھر بھی ان کو محض خشیۃ اللہ کے زیر اثر استعمال نہ کیا جائے ـــــ اگرچہ بازی ہر جانے کا اندیشہ ہو ـــــ ایسا ضبطِ نفس کوئی آسان کام نہیں ہے۔

لیکن ہم نے صورتِ حالات پر بار بار غور کر کے جب اپنی شرعی ذمہ داریوں کا صحیح اندازہ کیا تو ہم اس فیصلے پر پہنچے ـــــ اور ایک مسلم فرداً و جماعت اسی فیصلے پر پہنچ سکتی تھی ـــــ کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان اگر انتخابات میں پھوٹ پڑنے والی اخلاقی وباؤں کی زد میں آ رہی ہو تو یہ پرلے درجے کی خود غرضی ہو گی کہ کچھ لوگ وبا زدہ فضاؤں

سے الگ بیٹھ کر اپنی صحتوں کو بنانے میں لگے رہیں اور وباؤں کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دیں کہ وہ اخلاقی موت کا بازار اطمینان سے گرم کریں۔ ہماری شرکتِ انتخابات بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے جو کسی وبازدہ علاقے میں لوگوں کی جانیں بچانے، ان کو طبی امداد بہم پہنچانے حفظ ما تقدم کی تعلیم دینے اور صحت و صفائی کے اصولوں کو عمل میں لانے والی کسی خدمت پیشہ ٹیم کی ہوتی ہے۔ اس ٹیم کے افراد کو بلاشبہ اپنی صحتوں کے رکھ رکھاؤ کے لئے بہت زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ سارا اہتمام وبازدہ عوام کے اندر کام کرتے ہوئے ہی کیا جاتا ہے، نہ کہ انہیں چھوڑ کر۔

ہماری نگاہ میں جس طرح ایسے قیمتی فانوس اور ایسے سنہرے شمعدان کا وجود عدم برابر ہے جو کسی مزار کے سرہانے بے مصرف شعاعیں بکھیر رہا ہو اور آس پاس کے بیاباں میں انسانی قافلے بھٹک بھٹک کر ادر ٹھوکریں کھا کھا کر رہزنوں کا شکار ہو رہے ہوں، بالکل اسی طرح وہ ایمان و تقویٰ قلب و ذہن کیلئے محض ایک سامانِ زینت ہے جو سیاست و تمدن کے ماحول کو روشن کرنے کیلئے میدان میں آنے کے بجائے مسجد کی چار دیواری میں مخالف طاقتوں کے خوف کی وجہ سے بند پڑا رہتا ہے۔ ان جسموں کی صحتمندی کس کام کی جو لوگوں کو موت کا شکار ہوتے چھوڑ کر کسی کمین گاہ میں پڑے اپنی قوتوں کی تعمیر — محض برائے تعمیر — کرتے رہیں۔ اخلاق کا وہ سرمایہ جسے ہمیشہ نقصان کے اندیشے کے پیشِ نظر تجوریوں میں مقفل رکھا جائے اور جو ہمیشہ غیر پیدا آور Unproductive رہے اجتماعی زندگی کے لئے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ایک مسلم فرد اور مسلم جماعت کے پاس اگر کچھ بھی سرمایۂ ایمان و اخلاق ہو تو اسے زندگی کی مارکیٹ میں گردش کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔ پھر اگر صاحبِ سرمایہ میں صلاحیت ہو گی تو اسکی پونجی منافع لے کے لوٹے گی اور اگر وہ نا اہل ہو تو پھر منافع کیسا، اصل پونجی بھی ٹوٹے گی۔ لیکن پونجی کا مصرف ہے یہی کہ وہ مارکیٹ میں گردش رہے، ورنہ چاہے اسکی مقدار کتنی ہی بڑی ہو، وہ قطعاً کالعدم ہے۔

اب جب کہ ہم نے اپنے حقیر سے سرمایۂ ایمان و اخلاق کو انتخابات میں اسی طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جس طرح پہلے فسادات میں، پھر سرحد کے ریفرنڈم میں، پھر مہاجرین کی بحالی کے کام میں اور پھر تحریک مطالبہ میں اسے استعمال کیا تھا تو ہمیں وہ سارے اہتمام کرنے چاہئیں جو اسے نہ صرف ٹوٹے سے بچائیں، بلکہ اس پر ملک و ملت کو بھی اور خود ہم کو بھی مزید منافع دلائیں۔ ہمیں ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں کہ جب ہنگامۂ انتخابات سے

ہم فارغ ہوں اور اپنا میزانیہ Balance Sheet مرتب کریں تو ہمیں محسوس ہو کہ ہمارے اور ملّت کے ایمان و اخلاق میں ایک نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ ہم کو ایک قلیل البضاعت تاجر کی طرح اپنی آٹھ سال کی خون پسینے کی کمائی کو میدان میں ڈالتے ہوئے پوری طرح چوکنا ہونا چاہیئے اور اسکی نگہداشت کے سارے وسائل اختیار کرنے چاہئیں۔ اپنے چراغوں کو گھر کے طاقچوں سے اٹھا کر چراغ راہ بناتے ہوئے ان کی بتیوں کو درست کر لینا چاہیئے اور ان میں تیل ڈالتے رہنے کا انتظام کر لینا چاہیئے تاکہ ان کی لوئیں ہوا کے جھونکوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ہمیں وبا زدہ فضاؤں میں خدمتِ عوام کا کام کرنے کے لئے اپنی صحتوں کے تحفظ کا ہر ممکن انتظام پہلے سے کر لینا چاہیئے!

اس نازک آزمائش میں پڑتے ہوئے ہماری اوّلین ضرورت تعلق باللہ کی استواری ہے۔ یہ تعلق اگر اپنے کم سے کم معیارِ مطلوب سے گر جائے تو پھر ہماری ساری سرگرمیاں دنیا پرستانہ سیاست کا رنگ اختیار کر سکتی ہیں اور دلوں اور ذہنوں کے سارے دروازے شیاطین جن و انس کے لئے چوپٹ کھل سکتے ہیں۔ پھر کوئی پہرہ ایسا نہیں رہتا جو معصیت کے لشکروں کو ضمیروں کے قلعوں میں گھسنے سے روک سکے۔ تعلق باللہ کو قائم رکھنے اور اسے آئندہ مراحل کی ضروریات کے مطابق ترقی دینے کے لئے کم سے کم حسب ذیل امور کا اہتمام پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ کرنا ناگزیر ہے:-

(۱) جماعت اسلامی پر اللہ کا یہ فضل و کرم ہے کہ اس کے ارکان اور ہمدردوں میں سے کوئی بھی بنیادی عبادات کا تارک نہیں ہے، بلکہ شاید اس کے متفقین میں بھی ایسا گیا گذرا کوئی آدمی نہ ہوگا جو اللہ پر ایمان لانے اور اسکی عبودیت اختیار کرنے کے اوّلین عملی تقاضوں سے غافل ہو۔ لیکن صرف عبادات کی سرانجام دہی کافی نہیں، بلکہ ان میں پوری باقاعدگی اور اس کے ساتھ خشوع و خضوع کی جو صفات ہونی چاہئیں، ان میں اب تک معیارِ مطلوب سے ہم سب نیچے ہیں۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ہم اگر بڑے بڑے معرکوں میں کود پڑے —— اور یہ ظاہر ہے کہ معرکہ ہائے حیات سے ہم الگ نہیں رہ سکتے —— تو ہم کو خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہمارے رفقا کو یہ چاہیئے کہ کتاب وسنت سے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے ان شروط و کوائف کو معلوم کریں جو اللہ کو مطلوب ہیں اور پھر ان کے پورے اہتمام کی فکر کریں خصوصیت سے نماز کی کارروائی میں وقت کی شدید پابندی اور باجماعت نماز کی ایک بڑھتی ہوئی حرص اگر پیدا نہ ہو جائے تو نماز کے اندر خشوع وخضوع کے جوہر کو مکمل کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ عبادات میں جان اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے ساتھ محاسبۂ نفس کی عادت موجود نہ ہو۔ محاسبہ نفس نہ ہونے کی صورت میں عبادات کا ظاہری قالب چاہے کتنا ہی مکمل ہو، وہ کھوکھلی رہ جاتی ہیں۔

(۲) تعلق باللہ کو نشو و نما دینے کے لئے دوسری ضرورت قرآن اور حدیث کے براہِ راست مطالعہ کی ہے۔ وہ جماعت جس کی ساری سرگرمیوں کا دارومدار ہی اس تعلیم پر ہے جو کتاب وسنت میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے پیش فرمائی ہے، اس کے کارکن اگر روزمرہ ایمان وعلم کے ان سرچشموں سے سیراب ہوتے رہنے کی فکر نہ کریں تو کیا معلوم کہ کس قدم پر وہ بھٹک جائیں۔ دورِ جدید کی مقبولِ عالم جاہلیتوں کی جن تاریکیوں میں ہم کو اپنا سفر طے کرنا ہے اور علم وادب سے مسلح ہو کے رہزنی کرنے والے جن غول ہائے بیابانی کے نرغوں سے ہمیں گذرنا ہے ان کے ہوتے ہوئے حکمتِ دین کی قندیل کو ساتھ لئے بغیر اعتماد کے ساتھ چند فرلانگ بھی نہیں چلا جاسکتا۔ جماعت کے ہر کارکن کو گھنٹہ، آدھ گھنٹہ، ورنہ پندرہ بیس منٹ ہی، بہر حال کچھ وقت روزانہ اس مصرف پر باقاعدگی سے لگانا چاہیئے کہ جس اصول ونظام کے قیام کے لئے وہ سرگرداں ہے اسکی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو اصل ماخذ سے براہِ راست معلوم کرے۔ زیادہ اگر ممکن نہ ہو تو ایک آیت اور ایک حدیث کو بھی اگر پوری طرح سمجھ کر اور عملی زندگی میں اسے اپنانے ہوئے ہر روز پڑھا جاتا رہے تو انشاء اللہ تریاقِ حق کی یہ چھوٹی چھوٹی خوراکیں بھی اپنے تسلسل کی وجہ سے ہمیں زہریلی فضاؤں کے اثرات سے بچائے رکھیں گی۔

زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہفتہ وار اجتماعات میں بھی اور ان کے علاوہ روزانہ درس قرآن وحدیث جاری رکھنے کے لئے بھی جہاں کہیں مستقل انتظامات ممکن ہوں، کئے جائیں۔ جہاں درس دینے کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے والا کوئی عالم موجود نہ ہو، وہاں حلقۂ مطالعہ قائم کر کے مختلف تراجم پڑھ کر خدا اور رسول کے دین کا فہم وشعور حاصل کیا جائے۔ بدرجۂ آخر یہ صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ گھروں میں انفرادی طور پر صبح کی نماز یا ناشتے کے بعد اہل وعیال

کے حلقے میں بیٹھ کر ایک آیت اور ایک حدیث کو سمجھ سمجھا کے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

کتاب وسنت کے مطالعہ کی یہ سرگرمی بعض مقامی جماعتوں اور بعض افراد میں مناسب پیمانے پر موجود ہے لیکن بعض جماعتیں اور افراد اس میں اب تک کوتاہ ہیں۔ جتنا جلد اس کوتاہی کو دور کر لیا جائے، اتنا ہی تحریک اور اس کے مقصد کے حق میں بہتر ہو گا۔

کتاب وسنت کے سمجھنے میں جو لٹریچر ممد ہو ـــ خصوصاً جماعت کے لٹریچر ـــ کا مطالعہ بھی جاری رہنا چاہیئے۔ بہت سے ہمدرد اور نئے ارکان اپنے لٹریچر کے بعض حصص کا مطالعہ کرنے کے بعد مزید مطالعہ سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم تحریک اور نظامِ جماعت کو سمجھ چکے، اور کچھ وہ بھی ہیں جو ایک مرتبہ جن کتابوں کا چند سال پہلے مطالعہ کر چکے ہیں، ان کو دوبارہ تازہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ پورے لٹریچر کا مطالعہ اور بار بار مطالعہ اشد ضروری ہے، تاکہ ہر رفیق کا ذہن ان تمام مسائل کے متعلق صحیح معلومات سے مسلح رہے جن سے جماعت کو پہلے بھی واسطہ پڑا ہے اور آئندہ بھی پڑے گا۔ یہ اہتمام اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ وقت وقت کے مسائل میں ایک متفق علیہ رائے قائم کرنے کے لئے زاویۂ نگاہ کی جس یکسانی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ قائم رہ سکتی ہے۔

(۳) تعلق باللہ کے لئے تطوعات کا اہتمام جتنا ممکن ہو، ہر دور میں تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لئے ضروری رہا ہے۔ تطوعات میں ضروری امر یہ ہوتا ہے کہ ان کو دوام کے ساتھ عمل میں لایا جائے اور خاص طور پر ان کے اخفا کا لحاظ رکھا جائے۔ تطوعات میں نفل نماز خصوصاً تہجد کا مقام بلند ترین ہے۔ تہجد کی نماز مشکل مراحل سے گزرتے ہوئے تحریک اسلامی کے سپاہیوں کا بہترین سہارا ہوتی ہے۔ جو رفقا اس مقام پر نہ پہنچ سکیں وہ کسی دوسرے وقت میں نماز تطوع کی دو چار رکعتیں بہر حال اپنے اوپر لازم کرنے کی کوشش کریں۔

دوسرا درجہ نفل روزے کا ہے جو تعلق باللہ کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ مہینے میں تین روز کی روزہ داری مسنون بلکہ صائم الدھر رہنے کے برابر ہے۔ علاوہ بریں احادیث میں خاص خاص ایام کے لئے روزہ رکھنے کو پسند کیا گیا ہے۔ بہر حال اس معاملے میں ڈھیل ہے کہ ہر عشرے میں ایک دن یا ہر مہینے میں ایک دن نفلی روزے کے لئے نکالا جائے۔

پھر تطوعات میں انفاق فی سبیل اللہ کا ایک بلند رتبہ ہے۔ یوں بھی ہماری تحریک کی آبیاری بجز اس کے ممکن نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر فرد انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے سے سرشار ہو اور اپنی کمائی میں سے ایک حصہ اقامتِ دین کے لئے الگ کرتے رہنے کی عادت ڈال لے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اب ایسے ایسے مراحلِ کار سامنے آرہے ہیں کہ شاید ہم لوگوں کو اپنے زیور اور دوسرے اسباب زینت بیچ بیچ کر اللہ کے دین کی پرورش کرنی پڑے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے رفقا کی اکثریت غربا پر مشتمل ہے، چند ساتھی متوسط درجے کے ہیں اور دنیوی مفاد سے ہٹ کے چلنے والی تحریک کو امراء کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ ان حالات میں ارکان و ہمدردانِ جماعت جس درجے کا انفاق کرکے بیت المال کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، اس کی مثال کوئی دوسری دنیادار جماعت پیش نہیں کرسکتی، لیکن خدا شاہد ہے کہ ابھی یہ انفاق اس معیار سے بہت نیچے ہے جو انبیا کے صحابہ نے قائم کیا ہے۔ غور کیجیے اس نازک صورت حالات پر جواب ہمیں درپیش ہے، اس میں اگر کام محض اس وجہ سے بے نتیجہ رہ گیا کہ بیت المال کو اتنی غذا نہ مل سکی جس سے تحریک کی رگوں میں خون دوڑتا رہتا تو ہم لوگ آخر خدا تعالیٰ کو جواب کیا دینگے!

اس پہلو سے ہمیں اپنے جذبے کو ابھی اور زیادہ قوی کرنا ہے۔

(۴) تعلق باللہ کے لئے ایک بنیادی ضرورت ہمہ وقت کے ذکر و دعا کی ہے۔ خدا کے نبی صلعم نے رہبانیت آمیز ذکر کے بجائے اپنی امت کو صبح سے شام تک پیش آنے والے مراحل کے لئے ایک ایسا ذکر سکھایا ہے جو سوتے، جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، موقع بموقع جاری رہتا ہے۔ سو کر اٹھنے کے لئے، گھر سے نکلنے کے لئے، گھر میں آنے کے لئے، کوئی کام شروع کرنے کے لئے، کسی خوشی کے موقع پر، کسی غم و حسرت کے مقام پر، کسی غلطی کے سرزد ہو جانے پر، اذان سنتے ہوئے، وضو کرتے ہوئے، چھینک آنے پر، مسلمان بھائی سے ملتے ہوئے، کھانے سے فراغت پانے پر، پانی سے سیراب ہوتے ہوئے، غرضیکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے موقع کے لئے ذکر الٰہی اور دعائے خیر کے لئے نبی صلعم نے چھوٹے چھوٹے پاکیزہ کلمات سکھائے ہیں۔ ان کلمات کو شعور کے ساتھ ادا کرتے ہوئے ایک مسلمان اپنے آپ کو اپنے آقا و مولا سے وابستہ رکھتا ہے اور دنیا کے ہنگاموں میں کبھی بھی غافل ہو کر کھو نہیں جاتا۔ ذکر و دعا سے اس شخص کی زندگی بھر جاتی ہے جو صبح سے شام تک کبھی سبحٰن اللہ، کبھی الحمد للہ کبھی استغفر اللہ، کبھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ، کبھی صدق اللہ و رسولہ، کبھی رب اغفر وارحم، کبھی انت ولی

فی الدنیا وفی الآخرۃ، کبھی حسبی اللہ ربی کبھی نعم المولیٰ ونعم الوکیل سچے جذبے کے ساتھ کہتے ہوئے اپنے حاکم و کارساز سے تعلق کو قائم رکھتا ہے۔ وہ قدم قدم پر قادرِ مطلق سے توفیقِ خیر طلب کرتا ہے، وہ رہنمائی حاصل کرتا ہے، وہ بھلائی کی آرزو کرتا ہے، وہ شیطان کی سرگرمیوں کے مقابلے میں اسکی پناہ چاہتا ہے، وہ غلطیوں پر متنبہ ہو کر مغفرت کی درخواست کرتا ہے۔ اس طرح اسکی زندگی ہمہ تن ذکر اور ہمہ تن خیر بن جاتی ہے۔

اس طرح کے ہمہ وقت کے ذکر کو ــــ بشرطیکہ وہ شعوری ہو ــــ اپنانا جماعت اسلامی کے کارکنوں کے لئے بہت ضروری ہے نیز ہر لمحے اپنے ایمان، اخلاق، صبر و توکل اور ضبط و نظم کی مضبوطی کے لئے دعائیں اور آرزوئیں کرنا بھی ایک ایسا وظیفہ ہے جو کسی معرکہ میں کام کرتے ہوئے بہت ہی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔

واضح رہے کہ وہ ذکر و دعا جو شعوری نہ ہو، جس میں اپنے دل کے احوال و کوائف سے توجہ ہٹی ہوئی ہو جس میں اللہ کی حضوری کا احساس ناپید ہو، جو ریاکاری سے آلودہ ہو جائے اور جس کی حیثیت اعصاب کی ایک ورزش کی سی ہو جائے، اس سے نتائجِ مطلوبہ برآمد نہیں ہو سکتے۔ پس ذکر ہو تو فکر کے ساتھ ہو اور ریا سے پاک ہو۔

کسی بڑی مہم میں کوئی بھی جماعت اگر اس حالت میں شریک ہو کہ اس کا نظم ڈھیلا ہو تو اسکو اس موٹر گاڑی کا سا انجام پیش آسکتا ہے جس کے پرزے اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک کسے ہوتے نہ ہوں اور ڈرائیور اسے پہاڑی اور ریگستانی راستوں پر ایک لمبا سفر طے کرنے کے لئے لے نکلے اور پھر سفر میں جانے کے بعد قدم قدم پر اسے مشکلات کا سامنا ہو، یہاں تک کہ گاڑی کی مشین کسی نازک مرحلے پر بالکل ہی جواب دے دے۔

نظمِ جماعت بلاشبہ ہر جماعت کے لئے ایک طبعی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ہماری نگاہ میں طبعی ضرورت کے علاوہ اسکی حیثیت عین دین و اخلاق کی اور اللہ کی عبادت کی اور رسولِ کریم علیہ التحیۃ والسلام کی اطاعت کی ہے۔ اس وجہ سے دوسروں کے ہاں نظم کی کمزوری صرف اس لئے ناگوار ہوتی ہے کہ وہ کام میں حائل ہوتی ہے، لیکن ہمارے لئے تو وہ ایسی معصیت ہے جو عاقبت کو خراب کر دینے والی ہے۔ پس نظم جماعت کو کسے رکھنا اور اس کے لئے ہر رفیق کا پاسبان بن کے کھڑے رہنا ضروری ہے۔

نظم جماعت کے سلسلے میں چند اہم امور کا تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا:۔

(۱) نظمِ جماعت کی ریڑھ کی ہڈی امر و اطاعت کا توازن ہے۔ یہ توازن برقرار نہ رہے تو پھر نظمِ جماعت کے سرے سے کوئی معنی نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امر و طاعت کے توازن کو درہم برہم کر دینا وہ گناہِ کبیرہ ہے جو عین خدا و رسول کی نافرمانی ہے اور جس کے بعد دنیا و آخرت کی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن کا مطالبہ یہ ہے:-

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم	اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور تم (اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والوں) میں سے جو لوگ اولی الامر قرار پائیں ان کی اطاعت کرو۔

واضح رہے کہ یہ تینوں اطاعتیں واجب ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا ترک ایک مسلم کو خسران کے مقام پر لے آتا ہے۔ خود نبی صلعم نے فرمایا کہ:-

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ، ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصیٰ امیری فقد عصانی (بخاری و مسلم)	جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے میرے (یعنی آنحضورؐ کے مقرر کردہ یا آنحضورؐ کی پیروی کرنے والے) امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی!

حضرت ابوہریرہ کا ایک قول جو اسی مدعا کی وضاحت کرتا ہے عقد الفرید میں یوں درج ہے!

ان طاعۃ الائمۃ من طاعۃ اللہ و عصیانھم من عصیان اللہ	بلاشبہ ائمہ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور ان کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔

بے شمار احادیث و روایات جو اس سلسلے میں قطعی الاحکام ہیں کتبِ احادیث میں مذکور ہیں۔ ان سب کا مدعا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کو چلانے کے لئے یا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے جو نظمِ جماعت اسلامی آئین و حدود پر

قائم ہو، اس میں جو لوگ اسلامی معیارِ قیادت کے پیشِ نظر اپنے علم و تقوے میں ارفع ہونے کی بنا پر امارت کے لئے منتخب کئے گئے ہوں، ان کی اطاعت (فی المعروف) کرنا اہم ترین شرعی فرائض و واجبات میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلعم نے صاف صاف فرمایا کہ اگر نکٹا حبشی بھی امارت کے مقام پر سرفراز ہو تو باوجودیکہ اسکی شکل و صورت، اس کا نسلی و نسبی مقام، تمدنی آداب و رسوم میں اس کا ذوق، جذبات اور حسیات میں اس کا مخصوص رجحان کسی کا چاہے کتنا ہی ناپسند کیوں نہ ہو، اسکی پوری پوری اطاعت کرنا ضروری ہے۔ نبی صلعم نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ اس مطالبۂ اطاعتِ امیر سے جو لوگ روگردانی کریں، ان کے تقوے کی بڑی سے بڑی مقدار بھی انہیں آخرت کی کامرانی سے ہمکنار نہ کر سکے گی:۔

من خلع یداً من طاعۃٍ لقی اللّٰہ یوم القیٰمۃ لا حجۃ لہ (مسلم)	جس کسی نے طاعت امر سے اپنا ہاتھ چھڑالیا وہ قیامت کے روز اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ (اپنے آپ کو برسرِ حق ثابت کرنے کے لئے) اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی!

ان اشارات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظامِ جماعت میں نظامِ امارت کی حیثیت وہ نہیں ہے جو عام دنیا پرست سیاسی جماعتوں کے صدروں، نائب صدروں، صوبائی اور ضلعی ناظمین اور ان کے مشیروں کی ہوتی ہے۔ بلکہ اسلامی نظام امارت میں امیر، نائب امرا، صوبائی ضلعی اور مقامی امرا، دوسرے ناظمینِ شعبہ جات اور ان کے ارکان شوریٰ کا مقام ایک خاص طرح کا شرعی اور دینی مقام ہوتا ہے جس کے حقوق و واجبات بھی شرعی اور دینی ہیں، نہ کہ مصلحتی۔ ان وجوہ سے اسلامی نظامِ امارت کی اطاعت کا معاملہ ویسا نہیں ہے جیسا سیاسی پارٹیوں میں ہوتا ہے۔

جب تک اسلامی نظام جماعت کے اربابِ امر کتاب و سنت سے کھلا کھلا انحراف نہ کریں، ان کے احکام اور ان کی ہدایات سے سرتابی کرنا، یا ان کی اطاعت بطوع و رغبت کرنے کے بجائے بددلی کے ساتھ کرنا یا ان کے لئے خیر خواہانہ جذبات رکھنے کے بجائے کینہ و نفرت کے جذبات دلوں میں رکھنا، ان کے خلاف سازشیں کرنا، ان کی غیبت کرنا، ان کے متعلق بددلی پھیلانا، ان کو واقعات

داحوال سے آگاہ کرتے ہیں اور راہِ صواب پر چلنے کے لئے صحیح مشورے دینے میں بخل دکھاتا اور ان کے سونپے ہوئے رازوں کو نشر کرنا، یہ سب کچھ کبیرہ گناہوں میں داخل ہے۔ اور یہ ایسے کبائر ہیں کہ ان کی وجہ سے عبادت کی انجام دہی اور عام اخلاق کی درستی کے باوجود آدمی کی عاقبت تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ وہ خطرناک لائنیں ہیں جو آدمی کو نفاق کے گڑھے میں دھکیل سکتی ہیں، اس وجہ سے اسلامی نظام جماعت کے اندر چلنے والوں کو طاعتِ امرا کے معاملے میں بہت محتاط ہونا چاہیے۔

---

(۲) اسلام نے اندھی اطاعت کا مطالبہ یقیناً نہیں کیا ہے، بلکہ وہ صرف اطاعت فی المعروف چاہتا ہے معروف کی حدود سے باہر اس کا حکم "لا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کا ہے۔ اسلامی نظام جماعت اس کا مقتضی ہے کہ اس کے سارے ارکان امرا کی روش پر کڑی نگاہ رکھیں اور انہیں معروف کی حدود سے کوئی قدم باہر نہ نکلنے دیں، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ:-

یا ایھا الناس! من رای منکم فیّ اعوجاجاً فلیقومہ	اے لوگو! تم میں سے جو کوئی میرے رویے میں کوئی کجی دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ وہ میری اس کجی کو سیدھا کرے۔

اس سلسلے میں کسی امرِ اجتہادی میں اگر اختلاف ہو تو اسے صاف کرنے کے لئے اسے پیش کرنے کا، اس پر بحث کرنے کا، اور اگر صاف نہ ہو سکے تو اس پر قائم رہنے کا حق بھی جماعتِ اسلامی کے ارکان کو از روئے شریعت حاصل ہے، لیکن طاعت بہر حال اسی فیصلے کی کرنی لازم ہے جو اربابِ امر کی طرف سے نافذ العمل ہو۔ طاعت کا قلادہ گردن سے نکال لینے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ فیصلہ میری رائے کے خلاف کیوں ہوا اور حالات کو اس نظر سے کیوں نہیں دیکھا گیا جس نظر سے میں دیکھتا ہوں۔ طاعت کا قلادہ صرف اسی صورت میں نکالا جا سکتا ہے جب کہ بالفاظ رسالتمآب "ان تروا کفرا بواحاً" اسلام سے کھلا کھلا انحراف پایا جائے۔

امرا کو راہِ حق پر سیدھا رکھنے کے لئے تنقید بھی ماموریں کا ایک بنیادی حق ہے، لیکن اسلامی نظام جماعت میں تنقید اس سوئے ظن کے ساتھ کرنا جو سیاسی جماعتوں کا خاصہ ہے، غیر اسلامی طریق کا ہے۔ اسلامی نظام

جماعت میں تنقید حسنِ ظن کے ساتھ ہوتی ہے اور اس میں اعتراض اور شکایت کے انداز کے بجائے خیر خواہانہ مشورہ کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ اسلامی جماعت میں تنقید کا صرف وہی پاکیزہ اسلوب کھپ سکتا ہے کہ جس میں نہ ناقد کے اندر تلخ جذبات کام کر رہے ہوں اور نہ مخاطب میں اس سے کراہت پیدا ہو، وہ کہ جس میں کوئی انتقامی اسپرٹ شامل نہ ہو اور وہ کہ جس میں ذاتی کدورت موجود نہ ہو، وہ کہ جس میں اپنی بات منوانے کی ضد کا اثر نہ ہو اور وہ کہ جس کے قبول نہ کیے جانے پر آدمی پر بددلی کا دورہ نہ پڑ جائے۔ پھر اسلامی تنقید کی شان یہ ہے کہ وہ رو در رو ہوتی ہے، نہ کہ پسِ پشت۔ پسِ پشت اگر کچھ کہا جائے تو وہ غیبت ہے، نہ کہ تنقید۔ غیبت اسلامی نظام سے پرلے درجے کی بدخواہی ہے، حالانکہ تنقید اس کی بہترین خیر خواہی ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسلامی نظامِ جماعت میں امرا پر جتنے زیادہ صاف سے صاف الفاظ میں تنقید کی جائے، اتنا ہی جماعت کے حق میں رحمت ہوتا ہے، لیکن یہ بہرحال حفظ مراتب کے اسلامی اخلاق کے خلاف ہے کہ امرا پر طنز و تعریض کے چبھتے ہوئے فقرے کسے جائیں، ان کے لیے احترام سے ہٹے ہوئے فقرے استعمال کر کے دلوں کا بخار نکالا جائے، ان کا مذاق اڑایا جائے، یا ان کی کمزوریوں کا ذکر کر کر کے مزے لیے جائیں۔

حق تنقید کا یہ استعمال بھی مفسدہ انگیز ہوتا ہے کہ اس پر قانونی بندشیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے مستقل پیشہ بنا لیا جائے اور اہلِ امر کی ہر حرکت، ہر عمل اور ہر فیصلے پر، بلکہ ان کے ایک ایک فقرے پر جا و بے جا گرفت کرنے کا سلسلہ شروع ہو جائے اور ان سے ہر امر کے متعلق مطالبہ کیا جائے کہ اس کے پورے پورے دلائل بیان کرو۔ یہ حالت اگر پیدا ہو جائے تو امارت کی ذمہ داری کو لے کر کوئی انسان بھی ایک دن نہیں چل سکتا۔ پھر تو زمامِ امر ہاتھ میں لینے والے کا کام یہی رہ جائے گا کہ وہ مامورین کے سامنے بیٹھا جواب دہی کرتا رہے اور ان کے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے اپنے ایک ایک جملے اور ایک ایک فعل کا تفصیلی تجزیہ کر کر کے سمجھاتا رہے کہ اس میں کوئی قابلِ شکایت چیز نہیں ہے۔

ان سطور کے پیشِ نظر اگر سوچا جائے تو اندازہ ہوگا کہ امرا کے مقابلے میں حق نصح یا حق تنقید استعمال کرتے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلنا بہت ہی احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ اس احتیاط کے تقاضے سے اگر صرفِ نظر کر لیا جائے تو آدمی تنقید کا حق غلط اسلوب سے استعمال کرتے ہوئے نظامِ جماعت کے لیے ایک خطرناک روگ بن سکتا ہے اور خود

اس کی عاقبت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

غلط تنقید کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ طاعت میں حائل ہو جاتی ہے اور ایک شخص نظام امارت کے حقوق میں کھلی کھلی خیانت کرنے پر اتر آتا ہے۔ پس طاعت اپنی جگہ پر اور تنقید اپنی جگہ پر رہنی چاہیے۔ طاعت کو ختم کرنے والی چیز معصیتِ خالق کے ظہور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

---

(۳) نظامِ طاعت کی پابندی میں شخصیتوں کے ادل بدل سے کوئی فرق نہیں لایا جا سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک جماعت کے وسیع نظامِ امارت کا بار اٹھانے والی ایک بڑی ٹیم کے افراد میں سے کوئی اونچا ہو، کوئی نیچا، کسی کا علم زیادہ ہو، کسی کا تقویٰ، کسی کو دورِ جدید کے خاص تقاضوں پر زیادہ دسترس ہو اور کسی کو قرونِ اولیٰ کے شئون کی گہری بصیرت حاصل ہو، کسی کی نگاہ احکامِ شریعت کے ظاہر پر زیادہ رہتی ہو اور کوئی احکام کی حکمتوں کا لحاظ رکھنے میں خاص توجہ دے، کسی کے نزدیک تحریک کا ایک پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہو، کسی کے نزدیک دوسرا پہلو اولیں توجہ چاہتا ہو، پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کا مزاج ذرا سخت ہو، کسی کا نرم، کوئی زیادہ بے تکلفی کو پسند کرتا ہو، کوئی باوقار مسلک کا خوگر ہو، کوئی گرمیٔ گفتار کو پسند کرے اور کوئی خاموشی سے کام کرنے والا ہو۔ پھر لباس، وضع قطع، نشست و برخواست، کھانے پینے، وغیرہ وظائفِ زندگی میں مختلف افراد کے ذوق مختلف ہو سکتے ہیں۔ شخصی ذوق، رجحان اور طبیعت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو ایک نظامِ جماعت کی مجموعی پالیسی کی وحدت کے باوجود اپنا کام ایک خاص حد تک کرتے ہیں۔ ان فروق و اختلافات کی وجہ سے مختلف اہلِ امر کی حیثیتیں مختلف نہیں ہو جاتیں کہ ہر ایک کے حقوقِ طاعت میں کمی بیشی کی جا سکے اور اگر ان میں ادل بدل ہو جائے تو لوگ اس امر کی جستجو کریں کہ فلاں میں وہ ذوق اور وہ اطوار کیوں نہیں ہیں جو فلاں میں ہیں اور جب ایک قسم کے طرزِ عمل سے مانوس ہو جانے کے بعد کوئی ادل بدل واقع ہو تو طبائع میں اضطراب نمودار ہو اور حرکت و عمل کی رفتار سُست پڑنے لگے۔ اسی مفسدے کے سدِ باب کے لئے نبی صلعم نے یہ ہدایت دی تھی کہ ایک نکٹا حبشی بھی اگر کسی امر میں تمہارا امام ہو تو "فاسمعوا واطیعوا" پر عمل کرو اور یہ نہ دیکھو کہ اس کی صورت کیسی ہے اور اس کا لباس کیسا ہے اور اس کے ذوق اور آداب و شعائر کس طرح کے ہیں۔ طاعت کو شریعت نے اس امر پر منحصر نہیں کیا ہے کہ

اہلِ امر کا شخصی ذوق و رجحان ہر پہلو سے مامورین کی منشا کے مطابق ہو۔

اسلامی تحریک شخصیتوں کے محور پر نہیں گھومتی، بلکہ یہ ایک وقت میں اگر نبی صلعم کی رہنمائی میں چلتی ہے تو دوسرے وقت حضرتِ صدیقؓ "ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسول، افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم" کے کلمات بلند کرتے ہوئے آتے ہیں اور تحریک کی باگ ڈور سنبھال لیتے ہیں، اور آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا سخت مزاج خلیفہ اس کی عنانِ قیادت تھامتا ہے، پھر حضرت عثمان جیسی حلیم ہستی اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لیتی ہے اور پھر حضرت علی اپنی خصوصیات کے ساتھ اس کی سربراہ کاری کرتے ہیں ــــ اس سارے ادل بدل میں نظام طاعت کی فرضیت بحال رہتی ہے اور اسے توڑنا ایک ہی طرح کا گناہِ کبیرہ رہتا ہے۔

اس بات کو کبھی نہ بھولیئے کہ ہمیں مرکزی، صوبائی، ضلعی اور مقامی امارت کی اطاعت شخصیتوں کے پیش نظر نہیں، بلکہ ان مناصب کی شرعی حیثیت کے پیشِ نظر کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ پس شخصیتیں حالات و ضروریات کے ماتحت چاہے روزانہ بدلتی رہیں، لیکن خدا و رسول نے امارت کے جو حقوق ہمارے اوپر واجب ٹھہرائے ہیں، ان کی ادائی پوری دیانت داری کے ساتھ یکساں جاری رہنی چاہیئے۔

---

(۳) اب تک مامورین کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں، ان کے مقابل دوسری طرف اہل امر کی ذمہ داریاں ان سے بھی زیادہ نازک ہیں۔ جب تک اہل امر اپنے حصے کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا اہتمام نہ کریں نظامِ امر و طاعت کا توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ مامورین کے مقابلے میں اہل امر کی اخروی بازپرس بھی زیادہ شدید قسم کی ہوگی اور دنیا میں تحریکِ اسلامی کی کامیابی کا زیادہ دار و مدار بھی ان کی صحتِ کار پر ہوتا ہے۔ خود مامورین طاعت پر صحیح معنوں میں اسی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں جب کہ اہلِ امر اپنے حصّے کے فرض ــــ یعنی امر ــــ کے معاملے میں اپنے فرائض کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔

اس سلسلے میں ذیل کی آیت بہترین رہنمائی کرتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم کی شانِ امارت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم و لو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین۔

یہ کچھ اللہ ہی کی مہربانی ہے کہ آپ ان (مسلمانوں) کے لئے نرم خو ہیں، اور اگر آپ درشت کلام اور تلخ مزاج ہوتے تو یہ آپ کے آس پاس سے منتشر ہو جاتے پس ان کی غلطیوں سے درگزر کیجئے، ان کے لئے بخشش طلب کیجئے، اور معاملات میں ان سے مشورے لیجئے۔ پھر جب آپ (مشورے کے بعد) کسی بات کا تہیہ کر لیں تو اس کے بعد اللہ پر بھروسہ کریں۔ یقیناً اللہ (اپنے اوپر) بھروسہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اس آیت میں نبی صلعم کے پیروی میں کام کرنے والے ان تمام اہل امر کے لئے وہ بنیادی ہدایت دے دی گئی ہے جس کو ملحوظ رکھے بغیر اسلامی جماعت کا نظم خوبی سے کام نہیں کر سکتا۔ اسلامی امارت کے ہر فرد کو اس آیت کی روشنی میں جن امور کا پابند رہنا چاہیے اور جن کے مطابق اپنے مزاج کو ڈھالنا چاہیے وہ یہ ہیں:-

۱۔ کوئی امارت اپنا صحیح وظیفہ کامیابی سے سرانجام نہیں دے سکتی، جب تک کہ اس میں بلا امتیاز جملہ رفقائے جماعت کے لئے لینت، شفقت اور نرم خوئی کا وصف موجود نہ ہو۔ اسلامی نظام امارت کے ارکان کا رویہ ایسی جماعت گیر شفقت پر مشتمل ہونا چاہیئے کہ ہر فرد یہ محسوس کرے کہ سب سے زیادہ قرب اور سب سے زیادہ اعتماد شاید مجھی کو حاصل ہے کسی شخص کو اپنے دل کی بات کہنے میں جھجک نہ ہو کسی کو حلقہ اہل امر میں داخل ہوتے ہوئے کوئی ذہنی احساس مانع نہ ہو اور کسی فرد کو کوئی اونچ نیچ محسوس نہ ہو۔ یہ چیز جہاں نہیں ہوتی، وہاں اہل امر اور مامورین میں ذہنی، قلبی اور مجلسی بُعد پیدا ہوتا جاتا ہے اور رفاقت کی روح میں کمزوری آنے لگتی ہے۔ یہی حقیقت تھی جسے علامہ اقبال نے یوں بیان کیا تھا کہ:

"کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے ۔۔۔ کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی"

بس یہی خوئے دلنوازی ہے جس کا مطالبہ یہ آیت کرتی ہے۔

خوئے دلنوازی کے اس مطلب ہے سے یہ مراد لینا ایک زیادتی ہوگی کہ امیر کسی معاملے میں سختی نہ کریں، کسی کوتاہی پہ باز پرس نہ کریں، کسی نازیبا حرکت پر ٹوکنے نہ پائیں اور ایک ایک رکنِ جماعت کی خوشامد کرتے پھریں۔ بخلاف اس کے حکمت و مصلحت کے مطابق جہاں شدّت و غلظت سے کام لینے کے مواقع آئیں، وہاں سختی کرنے کا تلخ فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرنا جماعت کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ امارت کو اصول، مقصد اور نظم کی پاسبانی میں رفقا سے بسا اوقات تحکم کا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے، لیکن اس کی روح رحمت و شفقت کی روح ہوتی ہے، اگرچہ اس کا ظاہری پیرایہ سخت گیرانہ ہوتا ہے۔

ب۔ اہلِ امر کو چونکہ تمام رفقا کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے اور اس وجہ سے ان کے بہت سے عیوب، بہت سی کمزوریاں، بہت سی غلط کاریاں اہل امر کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ کسی نے اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں کوتاہی کر دی، کسی نے مخالفینِ تحریک سے کوئی نازیبا بات کہہ دی، کسی نے کوئی غلط جذباتی مظاہرہ کر دیا، کسی نے کوئی اہم راز کی بات برسرِ عام کہہ دی، کسی نے اپنے کسی رفیق سے یا کسی غیر سے بدمعاملگی کر دی، کسی نے غیبت کی، کسی نے شکایت کی ـــ اور ان حالات میں انسانی طبیعت بدگمانی اور تکدّر کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آہستہ آہستہ اس قسم کی کمزوریوں کو دیکھ دیکھ کر اہلِ امر کے دل خاص خاص افراد کے متعلق بھی اور اپنے پورے حلقے کے متعلق بھی تلخی سے بھرنے لگتے ہیں اور ایک طرح کی کراہت شدّت و غلظت کے روپ میں ربط ضبط اور طرزِ کلام میں ظاہر ہونے لگتی ہے اور اس سے دل پھٹتے ہیں، بدگمانیاں بڑھتی ہیں اور نظامِ امر و طاعت کے پیچ ڈھیلے ہونے لگتے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت اسی معاملے میں انتباہ کرتی ہے اور اہلِ امر کو وہ یہ درس دیتی ہے کہ وہ اپنے رفقا کی کمزوریوں کو دیکھیں اور ان کو معاف کرتے جائیں اور دل میں کسی طرح کی گرہ نہ پڑنے دیں اور اپنے اندر مایوسی اور تکدر کو داخل نہ ہونے دیں، کیونکہ مختلف طبائع مختلف کمزوریاں رکھتی ہیں اور بہت محنت کے بعد آہستہ آہستہ ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اپنی طرف سے عفو و درگزر سے کام لیا جائے، بلکہ شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی غیر حاضری میں اپنے اللہ سے ان کے لئے دعائے مغفرت کی جائے۔ یہ باہمی محبت کے جوڑ کو مضبوط کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ج۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کا اقتضا یہ ہے کہ اہل امر موقع بموقع اپنے مختلف رفقا سے ان کی

حیثیتوں اور ان کے علم و بصیرت کے مطابق مشورہ طلب کرتے رہیں۔ باہمی مشاورت سے اعتماد بڑھتا ہے، بدگمانیاں دور ہوتی ہیں اور فیصلوں پر عمل کرنے کرانے میں سہولت ہوتی ہے۔

مشورت یقیناً فرض ہے اور جس معاملے میں بھی جو رفقا بھی صحیح مشورہ دینے کے اہل ہوں ان سے استصواب کرنا عین ارشادِ الٰہی کا اتباع ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر معاملے میں ہر شخص سے لازماً مشورہ لیا جائے، بلکہ ضروری یہ ہے کہ جس معاملے میں جس کا مشورہ لینا مناسب ہو، اس سے ضرور مشورہ طلب کیا جائے۔ بعض صورتوں میں خاص اشخاص سے، بعض میں جماعت کی منتخب کردہ شوریٰ سے اور بعض میں عام ارکان اور رفقا سے حسبِ مصلحتِ جماعت مختلف معاملات میں رائے طلب کرنا اور پھر آراء پر غور و خوض کرنا اقامت دین کی جدوجہد کے لئے قوت بخش ہے، نیز اس سے نظامِ جماعت مستحکم رہتا ہے۔ مشاورت اس بات کا بھی بہترین وسیلہ ہے کہ اس کے ذریعے مختلف ذہن اور دماغ باہم ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، اور پیشِ نظر معاملات میں ہونے والے فیصلوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

(د) آخری ارشاد جو اہلِ امر کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس کا مفاد یہ ہے کہ جب ضروری مشورت کے بعد ایک معاملہ طے ہو جائے تو پھر اس پر ذہن کو یکسو کر کے مضبوطی سے قائم ہو جانا چاہیئے۔ ایک بڑی جماعت کے اہلِ امر کو روزمرہ کے مختلف پھیلے ہوئے امور و مسائل میں........ فیصلے ہو جانے کے بعد بھی اختلافِ آرا کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مسلسل نو بنو مشورے ان کے آگے رکھے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر فیصل شدہ امور میں بار بار ادل بدل کی پالیسی اختیار کی جائے تو عملی سرگرمیوں کا ایک رُخ پر کامیابی سے چلنا ممکن نہیں رہتا، بلکہ الٹا اہلِ امر کے دلوں میں تذبذب اور انتشارِ فکر کی خرابی اُبھرتی ہے جس سے جماعت کی مجموعی پالیسی میں بھی دوامی اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ انہی وجوہ سے شارع نے یہ چاہا ہے کہ باقاعدہ ایک نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد مشورے دینے والے رفقا کو اس بات کی تربیت کی جائے کہ وہ فیصل شدہ امور کو قبول کر کے عملی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔

---

(۵) نظمِ امر و طاعت کے سلسلے میں کہنے کی باتیں اور بھی ہیں:۔

ا۔ مختلف امارتوں اور تنظیمی دفتروں کی طرف سے جو سرکلر اور ہدایت نامے جاری ہوتے ہیں، ان کے بارے میں طاعت کی شرعی فرضیت کا احساس کچھ کمزور ہے۔ ان ہدایات اور گشتی مراسلوں کو غالباً معمولی دفتری چیزیں سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جماعت کے نظامِ امارت کے تحت کوئی بھی قیم یا سکرٹری جب بھی کوئی مراسلہ جاری کرتا ہے تو اسکی حیثیت عین اسی "امر بالمعروف" کی ہوتی ہے جس کے بارے میں "واطیعوا اولی الامر منکم" کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ مراسلے درحقیقت اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے ایک ایک لفظ پر پورا پورا غور کیا جائے اور ان کی بروقت تعمیل کے لئے پوری پوری قوت صرف کی جائے ——— اسی جذبۂ عبودیت کے ساتھ جس کے ساتھ تمام احکام شریعت کی تعمیل کی جاتی ہے۔

ب۔ اجتماعات میں حاضری کے لئے جو وقت مقرر کیا جاتا ہے، کسی ڈیوٹی پر پہنچنے کے لئے جو موقع اور جو لمحہ طے کیا جاتا ہے اور اسی طرح کسی اطلاع یا رپورٹ کے پہنچانے یا کسی امر کی تعمیل کے لئے جو صورت یا جو گھڑی متعین کی جاتی ہے، اس کی پابندی کرنے میں جس باقاعدگی کی ضرورت ہے، وہ ابھی ہم میں پیدا نہیں ہوئی۔ اس بات پر فخر کرنا ایک فضول حرکت ہے کہ دوسری جماعتوں سے ہماری باقاعدگی کا معیار بلند ہے، دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے باقاعدگی کا جو کم سے کم معیار قائم ہونا چاہیئے، وہ ہو سکا ہے یا نہیں؟ —— افسوس ہے کہ وہ ابھی نہیں ہو سکا، اور اس کے لئے خاص فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگ اب تک اس ذمہ داری کا پورا پورا احساس اپنے اندر پیدا نہیں کر سکے کہ ان میں سے ہر فرد کی حیثیت ایک چلتی کل کے پرزے کی سی ہے اور وہ پرزہ اگر اپنا مقررہ فرض سر انجام دینے میں تاخیر کر دیتا ہے یا بے قاعدگی سے کام لیتا ہے تو ساری کل اپنا وظیفہ بروقت پورا کرنے میں ناکام رہ جاتی ہے۔ اس کوتاہی کو ساتھ لے کر ہم کسی بڑی مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ رفقا کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو نظمِ جماعت کی کل کے پرزوں کی حیثیت سے باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کا فن سکھائیں۔

ج۔ جیسا کہ اوپر کی بحثوں سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، طاعتِ امر اور طاعتِ نظم میں کوتاہی کرنا ایک معصیت ہے جس کے لئے اپنے آقا و مولا کے حضور میں جواب دہی کرنی ہوگی لیکن محسوس یہی ہوتا ہے کہ اس طرح کی کوتاہیوں پر رفقا میں بندوں کی طرف سے باز پرس ہونے پر ایک حد تک ندامت تو ہوتی ہے،

لیکن ان میں بالعموم وہ احساس گناہ رونما نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے۔ طاعتِ امر اور طاعتِ نظم میں کوتاہی جھوٹ بولنے، کسی کو گالی دینے، وعدہ خلافی کرنے، حق تلفی کرنے، خیانت کرنے، چوری کرنے، غیبت کرنے، جھوٹی شہادت دینے اور اسی طرح کے دوسرے بڑے بڑے جرائم سے کم درجے کی چیز نہیں ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انفرادی اخلاق کے مذکورہ بالا تقاضوں سے اگر کبھی انحراف ہو جائے تو فوراً کھٹک ہونے لگتی ہے اور توبہ و انابت الی اللہ کا جذبہ ابھرتا ہے، لیکن جماعتی اخلاق کے تقاضوں کو پامال کرنے پر دلوں میں گنہ گار ہونے کا وہ احساس ندامت پوری طرح نہیں ابھرتا جو فوراً توبہ و استغفار اور تلافیٔ مافات اور اصلاحِ طرزِ عمل کی شکل اختیار کرلے۔

جماعتی اخلاق کی قدر و قیمت انفرادی اخلاق سے بدرجہا بلند ہے اور اسی وجہ سے جماعتی اخلاق میں کمزوری دکھانا زیادہ شدید قسم کی معصیت ہے۔ رفقا کو اب اس حقیقت کا احساس کرنا چاہیئے۔ ہم اگر فرائض مفوضہ کو انجام دینے میں، کسی کام کے لئے وقت نکالنے میں، کسی پروگرام میں اپنا حصہ ادا کرنے میں، کسی موقع متعین پر بروقت پہنچنے میں یا دوسری طرف اہلِ امر کے حقوق ادا کرنے میں، ان کی خیر خواہی کے تقاضے پورے کرنے میں صحیح اسلوبِ تنقید اختیار کرنے میں، مشورے اور معلومات بہم پہنچانے میں، رازداری کا حق ادا کرنے میں یا طاعتِ امر سے عہدہ برآ ہونے میں کوئی کوتاہی دکھائیں تو ایسی ہر کوتاہی پر ایک شدید قسم کا جذبۂ ندامت ہمارے اندر ابھرنا چاہیئے ـــــ ایسا جذبۂ ندامت جو توبہ و استغفار پر مائل کرے، جو عجز کی پیشانی حضورِ رب العلمین میں جھکانے پر آمادہ کرے، جو متعلقہ اہلِ امر یا رفقا سے معذرت طلبی پر اکسائے، جو تلافیٔ مافات کے لئے زیادہ شدید سرگرمیٔ کار پیدا کرے اور جو انفاق کی اسپرٹ کو ابھارے۔

یہ بات اگر ہم میں پیدا نہ ہوگی تو اسلامی خطوط پر اپنے نظمِ جماعت کو نشوونما دینا ہمارے لئے کبھی ممکن نہ ہوگا؟

---

(۵) امر و طاعت کے مذکورہ بالا تقاضوں کو نہ محض اپلیں پورا کرا سکتی ہیں، نہ دستور و آئین کی دفعات، بلکہ صرف رفقائے جماعت کا احساس ذمہ داری ہی ان تقاضوں کی تکمیل کا ضامن ہو سکتا ہے۔ (باقی بر صفحہ ۳۳۴)

"سود" میں نئے مباحث کا اضافہ

(مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اسیرِ پاکستان)

(۱)

نظام سرمایہ داری کا تاریخی پس منظر

جیسا کہ گذشتہ نمبر میں بتایا جا چکا ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی کتاب "سود" میں بطور ترمیم چند نئے مباحث قلمبند فرما کر ملتان جیل سے روانہ کیے ہیں۔ ان مباحث کو ایک علیحدہ ضمیمہ کے طور پر شائع کر دیا جائیگا۔ ضمیمہ کی اشاعت سے قبل انکو افادہ عام کیلئے ترجمان القرآن میں درج کیا جا رہا ہے۔ یقیناً "صاحب ترجمان" کی یہ تازہ تحریریں روحانی حیثیت سے ہم سب کیلئے "آدھی ملاقات" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (ادارہ)

قریب کے زمانہ میں دنیا کی فکری امامت اور عملی تدبیر، دونوں ہی کا سررشتہ اہل مغرب کے ہاتھ میں رہا ہے، اس لئے بالکل ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر آج کی صورت حال یہ ہے کہ تمدن اور سیاست اور معیشت کے بارے میں ہمارے بیشتر مسائل اور ان مسائل میں ہماری الجھنیں اُن حالات کی پیداوار ہیں جو مغربی زندگی میں انہی مسائل اور انہی الجھنوں کی پیدائش کے موجب ہوئے ہیں، اور اس کے ساتھ یہ بھی اس امامت ہی کا ایک فطری اثر ہے کہ ہمارے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت ان مسائل کے حل کی اُنہی صورتوں میں اپنے لئے رہنمائی تلاش کر رہی ہے جو مغربی مدبرین و مفکرین نے پیش کی ہیں۔ اس بنا پر یہ ناگزیر ہے کہ ہم سب سے پہلے موجودہ عمرانی مسائل کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لیں اور یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ان مسائل کے حل کی جو صورتیں آج تجویز یا اختیار کی جا رہی ہیں ان کا شجرہ نسب کیا ہے۔ اس تاریخی

بیان کی روشنی میں وہ مباحث زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکیں گے جن پر ہمیں اپنے موضوع کے سلسلہ میں گفتگو کرنی ہے۔

نظام جاگیرداری پانچویں صدی عیسوی میں جب مغربی رومن امپائر کا نظام درہم برہم ہوا تو یورپ کی تمدنی، سیاسی اور معاشی وحدت بالکل پارہ پارہ ہوگئی جس رشتے نے مختلف قوموں اور ملکوں کو باہم مربوط کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا، اور جس انتظام نے اس ربط و تعلق کو ممکن بنا رکھا تھا وہ بھی قائم نہ رہا۔ اگرچہ رومی قانون، اور رومی عالمگیریت، اور رومیوں کے سیاسی افکار کا ایک نقش تو اہلِ مغرب کے ذہن پر ضرور باقی رہ گیا جو آج تک موجود ہے، لیکن سلطنت کے ٹوٹنے سے سارا یورپ بے شمار چھوٹے چھوٹے اجزا میں بٹ گیا۔ ایک ایک جغرافی خطّے کے کئی کئی ٹکڑے ہوگئے۔ کہیں کسی ایک نسل کے لوگ اور ایک زبان بولنے والے لوگ بھی اپنی کوئی وحدت قائم نہ کر سکے۔ ساری مملکت تقسیم در تقسیم ہو کر اتنے چھوٹے ٹکڑوں میں متفرق ہوگئی جن کا انتظام مقامی رئیس اور جاگیردار سنبھال سکتے تھے۔ اس طرح یورپ میں اُس نظام زندگی کا آغاز ہوا جس کو اصطلاحاً "نظام جاگیرداری" (Feudal System) کہا جاتا ہے اس نظام میں بتدریج جو خصوصیات پیدا ہوئیں اور آگے چل کر سختی کے ساتھ منجمد ہوتی چلی گئیں وہ یہ تھیں:-

۱۔ بنائے اقتدار ملکیتِ زمین قرار پائی۔ عزت، طاقت، بالادستی، اور مستقل حقوق صرف اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہوگئے جو کسی علاقے میں مالکانِ زمین ہوں۔ وہی اپنے علاقے میں امن قائم کرتے تھے۔ انہی سے رئیس یا جاگیردار یا بادشاہ کا براہ راست تعلق ہوتا تھا۔ انہی کی سرپرستی میں علاقے کے وہ سب لوگ زندگی بسر کرتے تھے جو مالکان زمین کے طبقے سے تعلق نہ رکھتے ہوں، خواہ وہ مزارعین ہوں، یا اہل حرفہ یا اہل تجارت۔ یہ سب گویا رعیت تھے۔ پھر خود اس رعیت میں بھی بہت سے طبقات تھے جن میں سے کوئی اونچا اور کوئی نیچا تھا۔ یہ طبقاتی تقسیم اور اس تقسیم کی بنا پر مراتب درجات اور حقوق کی تفریق اُس سوسائٹی میں گہری جڑوں کے ساتھ جم گئی تھی۔ اس طرح نظام جاگیرداری کا معاشرہ ایک زینے کی سی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ہر سیڑھی پر بیٹھنے والا اپنے سے نیچے والے کا خدا اور اپنے سے اوپر والے کا بندہ بنا ہوا تھا۔ اس میں سب سے اوپر علاقے کے والیِ ریاست کا خاندان ہوتا تھا اور سب سے نیچے وہ غریب عوام ہوتے تھے جو کسی پر بھی اپنی خدائی کا زور نہ چلا سکتے تھے۔

۲۔ مسیحی کلیسا جو خدا کے نام پر لوگوں سے بات کرتا تھا، مگر جس کے پاس فی الحقیقت کوئی خدائی قانون اور کوئی اصولی ہدایت نامہ موجود نہ تھا، اس وقت یورپ میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اس نے اس نوخیز نظام جاگیرداری سے موافقت کر لی اور وہ ان تمام روایتی اداروں اور حقوق اور امتیازات اور پابندیوں کو مذہبی سند عطا کرتا چلا گیا جو اس نظام کے ساتھ ساتھ معاشرے میں جڑ پکڑ رہے تھے۔ ہر خیال جو پرانا ہوگیا، کلیسا کا عقیدہ بن گیا اور اس کے خلاف کچھ سوچنا کفر قرار پایا۔ ہر رسم جو ایک دفعہ پڑ گئی شریعت بن کر رہ گئی اور اس سے انحراف کے معنی خدا اور اس کے دین سے انحراف کے ہو گئے۔ ادب و فلسفہ ہو یا معاشرت اور سیاست اور معیشت، غرض جس چیز کی بھی جو شکل نظام جاگیرداری میں قائم ہو گئی تھی، کلیسا نے اس کو خدا کی دی ہوئی شکل ٹھہرا دیا اور اس بنا پر اس کو بدلنے کی کوشش جرم ہی نہیں، حرام بھی ہو گئی۔

۳۔ چونکہ کوئی ایسا مرکزی اقتدار اور انتظام موجود نہ تھا جو بڑی شاہراہوں کو تعمیر کرتا اور انہیں درست حالت میں رکھتا اور ان پر امن قائم کرتا، اس لئے دور دراز کے سفر، اور بڑے پیمانے پر تجارت، اور کثیر مقدار میں اشیاء ضرورت کی تیاری اور کھپت، غرض اس قسم کی ساری سرگرمیاں بند ہو گئیں اور تجارتیں، صنعتیں اور ذہنیتیں، سب اُن چھوٹے چھوٹے جغرافی خطوں میں سکڑ کر رہ گئیں جن کے حدود اربعہ جاگیرداروں کے اقتدار نے کھینچ رکھے تھے۔

۴۔ صنعت اور تجارت کا ایک ایک شعبہ ایک ایک کاروباری اور پیشہ ور برادری کا اجارہ بن گیا۔ نہ برادری کا کوئی آدمی اپنے پیشے سے نکل سکتا اور نہ کوئی بیرونی آدمی کسی پیشے میں داخل ہو سکتا تھا۔ ہر برادری اپنے کام کو اپنے ہی حلقے میں محدود رکھنے پر مصر تھی۔ مال فوری اور مقامی ضروریات کے لئے تیار ہوتا، آس پاس کے علاقوں ہی میں کھپ جاتا، اور زیادہ تر اجناس کے بدلے اس کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ ان مختلف اسباب نے ترقی، توسیع، ایجاد، فنی اصلاح، اور اجتماع سرمایہ کا دروازہ تقریباً بند کر رکھا تھا۔

ان خرابیوں کو، جو رومن امپائر کے زوال و سقوط سے پیدا ہوئی تھیں، ہولی رومن امپائر کے قیام نے کچھ بھی دور نہ کیا۔ پوپ اور قیصر نے چاہے روحانی و اخلاقی اور کسی حد تک سیاسی حیثیت سے پھر ایک رشتۂ وحدت یورپ کو بہم پہنچا دیا ہو، لیکن جاگیرداری نظام میں تمدن و معاشرت اور معیشت کی جو صورت بن

چکی تھی وہ نہ صرف یہ کہ بدلی نہیں، بلکہ ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی کہ اس کے سوا نظامِ زندگی کی کوئی دوسری صورت گویا سوچی ہی نہ جا سکتی تھی۔

نشاۃ ثانیہ اس جمود کے ٹوٹنے کی ابتدا کس طرح کن اسباب سے ہوئی اور کس طرح یورپ میں وہ ہمہ گیر تحریک اٹھی جو نشاۃ ثانیہ (Renissance) کے نام سے مشہور ہے، یہ بحث ہمارے موضوع سے بہت ہٹی ہوئی ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ایک طرف ہسپانیہ اور صقلیہ پر مسلمانوں کے قبضے نے اور دوسری طرف صلیبی لڑائیوں نے اہل مغرب کو دنیا کی اُن قوموں سے دوچار کیا جو اس وقت تہذیب و تمدن کی علمبردار تھیں۔ اگرچہ تعصب کے اُس پردے نے جو کلیسا کے اثر سے اہل مغرب کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا، ان لوگوں کو براہِ راست اسلام کی طرف تو متوجہ نہ ہونے دیا لیکن مسلمانوں سے جو سابقہ ان کو پیش آیا اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ خیالات، معلومات اور ترقی یافتہ طریقوں کی ایک وسیع دولت ان کے ہاتھ آئی اور وہی آخر کار ایک نئے دور کے آغاز کی موجب ہوئی۔

چودھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں دورِ متوسط سے دورِ جدید کی طرف عبور کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں مغربی زندگی کا ہر پہلو اُن اثرات کی وجہ سے حرکت میں آگیا جو بیرونی دنیا سے درآمد ہو رہے تھے۔ طبعیات، طب، ریاضی، انجینیرنگ اور دوسرے شعبوں میں اہل مغرب کا علم بڑھنا شروع ہوا۔ پریس کی ایجاد نے اشاعتِ خیالات اور اشاعتِ علم کی رفتار تیز کر دی۔ علمی بیداری کے ساتھ لازماً ہر شعبۂ حیات میں تنقید و اصلاح کا سلسلہ چل پڑا۔ نئے فنون کی واقفیت نے صنعت، زراعت، تجارت، اور عام طور پر پورے تمدن میں جان ڈال دی۔ پھر نئی جغرافی دریافتوں سے فکر و نظر میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی اور اس کے ساتھ اہل مغرب کے لئے دور دراز کے ملکوں میں ایسی منڈیاں بھی کھلنی شروع ہوگئیں جہاں وہ اپنے ملک کی مصنوعات اور خام پیداوار نکال سکیں اور دوسرے ملکوں کی مصنوعات اور خام پیداوار خرید سکیں۔ ان مواقع سے تجارت کا وہ بازار جو صدیوں سے سرد پڑا ہوا تھا، از سرِ نو گرم ہونے لگا۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود یورپ کے اندر بھی اور باہر بھی سوداگری کا روبار پھیلنا شروع ہوا۔ بڑے بڑے تجارتی چوراہوں پر شہر بستے اور بڑھتے چلے گئے۔ دولت، طاقت، ذہانت، تہذیب اور تمدن کا مرکز بتدریج جاگیروں اور ریاستوں کے قصباتی صدر مقامات سے ہٹ کر ان بڑے بڑے شہروں کی طرف

سر کنے لگا جو تجارت اور صنعت اور جدید علمی و ادبی حرکت کے مرکز بن رہے تھے۔

اس نئی حرکت کے میر کارواں وہ "بورژوا" طبقہ کے لوگ (یعنی سوداگر، ساہوکار، اہل حرفہ، اور بحری تجار وغیرہ) تھے جو ترقی کے ان مواقع سے مستفید ہوتے تھے، شہروں میں آباد تھے، باہر آمد و رفت رکھتے تھے یا کم از کم باہر سے آنے والے اثرات کی زد میں تھے، اور جن کے اندر تغیر اور ترقی کی ایک لگن پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ان لوگوں کے ابھرنے اور آگے بڑھنے میں ہر طرف سے اُن فکری، اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی و معاشی بندشوں نے سخت روکاوٹیں حائد کر رکھی تھیں جو کلیسا اور جاگیرداری کے گٹھ جوڑ سے قائم ہوتی تھیں۔ زندگی کے جس شعبے میں بھی یہ لوگ صدیوں کے بنے اور جمے ہوئے دائروں سے قدم باہر نکالتے، پادری اور جاگیردار، دونوں مل کر ان کا راستہ روک لیتے تھے۔ اس بنا پر ان دونوں طاقتوں کے خلاف ایک ہمہ گیر کشمکش کا آغاز ہوا اور ایک چومکھی لڑائی ہر میدان میں چھڑ گئی۔ علم و ادب کے میدان میں کلیسا کے حائد کردہ ذہنی استبداد کو چیلنج کیا گیا اور آزادیِ فکر و تحقیق کے حق پر زور دیا گیا۔ معیشت اور معاشرت اور سیاست کے میدان میں جاگیرداروں کے اقتدار کو چیلنج کیا گیا اور اُن سارے امتیازات کے خلاف آواز اٹھائی گئی جو نظام جاگیرداری کے تحت قائم تھے۔ آہستہ آہستہ یہ جنگ پرانے نظام کی پسپائی اور ان نوخیز طاقتوں کی پیش قدمی پر منتج ہوتی چلی گئی اور سولہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں چھوٹی چھوٹی جاگیرداریاں ٹوٹ ٹوٹ کر بڑی بڑی قومی ریاستوں میں جذب ہونے لگیں، پوپ کے روحانی تسلط کا طلسم ٹوٹ گیا، نئی قومی ریاستوں کے غیر مذہبی حکمرانوں نے کلیسا کی املاک ضبط کرنی شروع کر دیں، ایک عالمگیر مذہبی نظام کو چھوڑ کر مختلف قوموں نے اپنے اپنے الگ قومی کلیسا بنانے شروع کر دیئے جو قومی ریاستوں کے حریف یا شریک و سہیم ہونے کے بجائے اُن کے دست نگر تھے، اور اس طرح چرچ اور جاگیرداری کے مشترک غلبے کی بندشیں ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ بورژوا طبقہ اُن معاشرتی اور روایتی رکاوٹوں سے آزاد ہوتا چلا گیا جو اس پرانے نظام نے اسکی راہ میں حائل کر رکھی تھیں۔

دور متوسط کا لبرلزم کلیسا اور جاگیرداری کے خلاف یہ جنگ جن نظریات کی بنا پر لڑی گئی اُن کا سر عنوان "لبرلزم" تھا یعنی وسیع المشربی۔ نئے دور کے علمبردار زندگی کے ہر شعبے اور فکر و عمل کے ہر میدان میں وسعتِ مشرب، فیاضی، فراخ دلی اور کشادگی کا وعظ کہتے تھے، عام اس سے کہ وہ مذہب اور فلسفے اور علم و فن کے میدان ہوں، یا معاشرت

اور تمدن اور سیاست اور معیشت کے میدان - وہ ترقی پسند انسان کے راستے سے ہر طرف بندشوں اور رکاوٹوں اور تنگیوں اور سختیوں کو دور کر دینا چاہتے تھے۔

اس کشمکش میں اگر اہل کلیسا اور جاگیرداروں کی تنگ خیالی ایک انتہا پر تھی تو ان بورژوا حضرات کی وسعتِ مشرب دوسری انتہا کی طرف چلی جا رہی تھی - دونوں طرف خود غرضیاں کارفرما تھیں۔ حق اور انصاف اور علمِ صحیح اور فکرِ صالح سے دونوں کو کچھ واسطہ نہ تھا۔ ایک گروہ نے اگر بے اصل عقائد، ناروا امتیازات اور زبردستی کے قائم کردہ حقوق کی مدافعت میں خدا اور دین اور اخلاق کا نام استعمال کیا، تو دوسرے گروہ نے اس کی ضد میں آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے نام سے مذہب و اخلاق کی اُن صداقتوں کو بھی متزلزل کرنا شروع کر دیا جو ہمیشہ سے مسلّم چلی آ رہی تھیں - یہی زمانہ تھا جس میں سیاست کا رشتہ اخلاق سے توڑا گیا اور میکیاویلی نے کھلم کھلا اس نظریہ کی وکالت کی کہ سیاسی اغراض و مصالح کے معاملہ میں اخلاقی اصولوں کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہی زمانہ تھا جس میں کلیسا اور جاگیرداری کے بالمقابل قومیت اور قوم پرستی اور قومی ریاست کے بت تراشے گئے اور اُس فتنے کی بنا ڈالی گئی جس کی بدولت آج دنیا لڑائیوں اور قومی عداوتوں کا ایک کوہ آتش فشاں بنی ہوئی ہے - اور یہی وہ زمانہ تھا جس میں پہلی مرتبہ سود کے جائز و مباح ہونے کا تخیل پیدا ہوا، حالانکہ قدیم ترین زمانے سے تمام دنیا کے اہلِ دین و اخلاق اور علمائے قانون اس چیز کی حرمت پر متفق تھے، صرف تورات اور قرآن ہی نے اس کو حرام نہیں ٹھیرایا تھا بلکہ ارسطو اور افلاطون بھی اس کی حرمت کے قائل تھے، اور یونان اور روم کے قوانین میں بھی یہ چیز ممنوع تھی۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب بورژوا طبقہ نے مسیحی کلیسا کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تو پہلے سود کو ایک ناگزیر برائی کہنا شروع کیا گیا یہاں تک کہ اس پرزور پروپگنڈا سے مرعوب ہو کر مسیحی متجددین (Reformists) بھی اس کو انسانی کمزوری کے عذر کی بنا پر "اضطراراً" جائز ٹھیرانے لگے، پھر رفتہ رفتہ ساری اخلاقی گفتگو صرف شرحِ سود پر مرکوز ہو گئی اور تمام اہلِ فکر اپنا سارا زور اس بحث پر صرف کرنے لگے کہ سود کی شرح "معقول" ہونی چاہیے، اور آخر کار یہ تخیل جڑ پکڑ گیا کہ مذہب و اخلاق کو کاروباری معاملات سے کیا غرض، معاشی حیثیت سے سود سراسر ایک فطری اور معقول چیز ہے جس طرح کرایۂ مکان کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا اسی طرح سود کے خلاف بھی کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ہے!

لطف یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ ہی کے دور میں اس بورژوا طبقے نے اپنی اس وسیع المشربی کا صور پھونک پھونک کر پادریوں اور جاگیرداروں اور مالکان زمین کے قبضے سے جتنا میدان نکالا اس کے وہ تنہا خود ہی "حق دار" بنتے چلے گئے۔ اُن کی وسیع المشربی نے ان کو یہ یاد نہ دلایا کہ ان سے فروتر ایک اور طبقہ عوام الناس کا بھی موجود ہے جو جاگیرداری نظام میں ان کی بہ نسبت زیادہ مظلوم تھا، اور اب اس لبرل نظام کے فوائد میں سے وہ بھی حصہ پانے کا حق رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر جب انگلستان میں پارلیمنٹری طرز حکومت کی بنا پڑی اور پارلیمنٹ میں اصل اقتدار اُمرا و (لارڈس) کے ہاتھ سے نکل کر "عوام" (کامنز) کے ہاتھ میں آیا تو اس سارے اقتدار کو اپنی وسیع المشرب بورژوا حضرات نے اچک لیا۔ جن دلائل سے انہوں نے اپنے لئے ووٹ کا حق حاصل کیا تھا وہ دلائل نچلے طبقے کے عوام کو ووٹ کا حق دینے سے انکار کرتے وقت ان کو یاد نہ آئے۔

صنعتی انقلاب اٹھارویں صدی عیسوی میں مشین کی ایجاد نے اُس انقلاب کی رفتار کو بدرجہا زیادہ تیز کر دیا جس کی ابتدا نشاۃ ثانیہ کے دور میں ہوئی تھی۔ نئی سائنٹفک معلومات اور ایجادات کو جب صنعت و حرفت، زراعت، اور وسائل آمد و رفت کی ترقی میں استعمال کیا گیا تو نئے بڑے پیمانے پر مصنوعات کی تیاری، خام پیداوار کی فراہمی اور دنیا کے گوشے گوشے میں تیار مال کی کھپت کا سلسلہ چل پڑا جس کا تصور بھی اس سے پہلے کبھی نہ کیا گیا تھا۔

اس عظیم الشان انقلاب نے ترقی، خوشحالی اور قوت و اقتدار کے جن مواقع کا دروازہ کھولا ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے قریب ترین گروہ اگر کوئی تھا تو وہی "بورژوا" گروہ تھا جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں ابھر آیا تھا۔ کیونکہ صنعت و تجارت اسی کے ہاتھ میں تھی، سرمایہ بھی اسی کے پاس تھا، اور علم و ادب پر بھی وہی چھایا ہوا تھا۔ اس نے سرمایہ اور فنی قابلیت اور تنظیمی صلاحیت، تینوں کے اشتراک سے صنعت اور کاروبار کا ایک نیا نظام بنا کھڑا کیا جسے "جدید نظامِ سرمایہ داری" کہا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت شہروں میں بڑے بڑے کارخانے اور تجارتی ادارے قائم ہوئے۔ پیشہ ور برادریوں کے پرانے حلقے ٹوٹ گئے۔ چھوٹے چھوٹے کارخانوں اور منفرد کاریگروں اور چھوٹی پونجی والے دوکانداروں کے لئے دائرۂ زندگی تنگ ہو گیا۔ دیہات و قصبات کے پیشہ ور لوگ مجبور ہو گئے کہ شہروں میں آئیں اور ان بڑے کارخانہ داروں کے دروازے پر مزدور کی حیثیت سے جا کھڑے

ہوں۔ اور چھوٹے موٹے سوداگر اور کاروباری لوگ بھی مجبور ہو گئے کہ ان بڑے صناعوں اور تاجروں کی ملازمت یا ایجنسی قبول کرلیں۔ اس طرح سائنس کی نئی دریافتوں سے جو طاقت آئی تھی اسے بورژوا طبقے نے اچک لیا اور اپنی فتوحات کا دائرہ پھیلانا شروع کر دیا۔

اس دائرے کے پھیلاؤ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ قومی ریاستیں تھیں جو نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان ریاستوں کے مطلق العنان بادشاہ "خداداد حق" کے مدعی تھے۔ سابق جاگیرداری نظام کے امراء ان بادشاہوں کی "پائیگاہ" بن گئے تھے، اور قومی کلیسا ان کے لئے مذہبی و روحانی پشت پناہ تھے سارا سیاسی اقتدار اسی تثلیث کے قبضے میں تھا، اور بورژوا طبقے کے لئے اس تثلیث کی فرمانروائی طرح طرح کی روکاوٹیں پیدا کرتی تھی۔ اس کی ڈالی ہوئی رکاوٹیں نہ صرف صنعت اور تجارت کے میدان میں اس طبقے کی پیشقدمی کو روکتی تھیں، بلکہ تمدن اور معاشرت میں بھی دورِ جاگیرداری کے وہ بہت سے باقیات ابھی موجود تھے جو اس نوخیز طبقے کو ناگوار تھے۔

جدید لبرلزم اس دور میں وہی لبرلزم "جس نے پچھلی لڑائی جیتی تھی" نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اٹھا اور اس نے سیاسیات میں جمہوریت کا، اور معاشرت اور تمدن اور اخلاق اور ادب میں انفرادی آزادی کا، اور معاشیات میں بے قیدی (Laissezpaire Policy) کا صور پھونکنا شروع کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چرچ ہو، یا اسٹیٹ یا سوسائٹی، کسی کو بھی فرد کی سعیِ ارتقاء اور سعیِ انتفاع میں رکاوٹیں عائد کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہر شخص کو بالکل آزادی کے ساتھ یہ موقع حاصل ہونا چاہیئے کہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق استعمال کرے اور جتنا آگے بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے۔ خود سوسائٹی کے مفاد کی بھی بہترین خدمت اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس کے ہر فرد کو غیر محدود آزادی حاصل ہو۔ ہر شعبۂ حیات اور ہر راہِ عمل میں مکمل آزادی، ہر خارجی رکاوٹ سے، ہر رسمی قید سے، ہر مذہبی و اخلاقی بندش سے، اور ہر قانونی یا اجتماعی مداخلت سے پوری آزادی۔ اس طرح اس نظریہ کے حامیوں نے ہر طرف رواداری، بے قیدی، اباحیت، انفرادیت، اور قصہ مختصر یہ کہ اپنی اصطلاحِ خاص میں "معقولیت" کو برسرکار لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

سیاسیات میں ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کے اختیارات کم سے کم ہوں اور فرد کی آزادی کے حدود زیادہ

زیادہ۔ حکومت صرف ایک عدل قائم کرنے والی ایجنسی ہو جو افراد کو ایک دوسرے کے حدود میں دخل اندازی ہونے سے روکتی رہے اور انفرادی آزادی کی حفاظت کرے۔ باقی رہی تمدنی و معاشی زندگی، تو اس کا سارا کاروبار افراد کی آزادانہ سعی و عمل اور فکر و تدبیر کے بل پر چلنا چاہیئے۔ اس میں حکومت کو نہ عامل کی حیثیت ہی سے دخل دینے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ رہنما ہی کی حیثیت سے۔ اس کے ساتھ سیاسیات میں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ حکمرانی کا اقتدار نہ تو کسی شاہی خاندان کی ملک رہے۔ اور نہ چند زمیندار گھرانوں کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ ملک عام باشندوں کا ہے۔ حکومت کا سارا کاروبار انہی کے دیئے ہوئے ٹیکسوں سے چلتا ہے۔ لہٰذا انہی کی رائے سے حکومتیں بنی اور ٹوٹنی اور بدلنی چاہئیں اور انہی کی آواز کو قانون سازی اور نظم و نسق میں فیصلہ کن اثر حاصل ہونا چاہیئے ——— یہی نظریات اُن جدید جمہوریتوں کی بنیاد بنے جو اٹھارویں صدی کے آخر سے دنیا میں قائم ہونی شروع ہوئیں۔

معاشیات میں جس اصول پر انہوں نے زور دیا وہ یہ تھا کہ اگر فطری توانین معیشت کو خارجی مداخلت اور دخل اندازی کے بغیر خود کام کرنے دیا جائے تو افراد کی انفرادی کوششوں سے آپ ہی آپ اجتماعی فلاح کی بڑی سے بڑی خدمت انجام پاتی چلی جائیں گی۔ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہوگی اور اس کی تقسیم بھی بہتر سے بہتر طریقہ پر ہوتی رہیگی، بشرطیکہ لوگوں کو سعی و عمل کی آزادی حاصل رہے اور حکومت اس فطری عمل میں مصنوعی طور پر مداخلت نہ کرے۔ بے قید معیشت کا یہی اصول جدید نظام سرمایہ داری کا بنیادی فارمولا قرار پایا۔

اس میں شک نہیں کہ نشأۃ جدید کے دور کی وسیع المشربی کی طرح یہ صنعتی انقلاب کے دور کی وسیع المشربی بھی اپنے اندر صداقت کے کچھ عناصر رکھتی تھی اور یہی عناصر آخر کار اسکی فتح یابی کے موجب ہوئے۔ لیکن یہاں پھر مغربی ذہن کی وہی دو بنیادی کمزوریاں اس صداقت کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں جن کو پاپائی و جاگیرداری کے دور سے ہم برابر کارفرما دیکھتے چلے آرہے ہیں یعنی خود غرضی اور انتہا پسندی۔

خود غرضی کا کرشمہ یہ تھا کہ ان میں سے اکثر کے مطالبۂ حق و انصاف میں کوئی خلوص نہ تھا۔ جو صحیح اصول وہ پیش کرتے تھے ان کی اصل محرک حق پسندی نہ تھی بلکہ صرف یہ بات تھی کہ وہ ان کی اغراض کے لئے مفید تھے۔ اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ جن حقوق کا خود اپنے لئے مطالبہ کرتے تھے وہی حقوق اپنے مزدوروں اور نادار عوام کو دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

وہی انتہا پسندی، تو وہ ان کے مخلص اہل علم اور اہل قلم حضرات کی بات بات میں نمایاں تھی۔ چند صداقتوں کو انہوں نے لیا اور انہیں ان کی حد سے بہت زیادہ بڑھا دیا۔ چند دوسری صداقتوں کو انہوں نے نظر انداز کر دیا اور زندگی میں جو مقام اُن کے لئے تھا اُس میں بھی اپنی منظورِ نظر صداقتوں کو لا بٹھایا۔ حالانکہ ہر صداقت اپنی حد سے نکل جانے کے بعد جھوٹ بن جاتی ہے اور الٹے نتائج دکھانے لگتی ہے۔ یہ افراط و تفریط اُس نظام حیات کے سارے ہی گوشوں میں پائی جاتی ہے جو بے قیدی، "انفرادیت" اور "جمہوریت" کے اِن نظریات کے زیر اثر مرتب ہوا۔ لیکن اس وقت ہمارا موضوع چونکہ خاص طور پر معیشت کا گوشہ ہے، اس لئے ہم دوسرے گوشوں کو چھوڑتے ہوئے صرف اِسی گوشے کا جائزہ لے کر یہ دکھائیں گے کہ فطری قوانین معیشت کے ساتھ خود غرضی اور انتہا پسندی کی آمیزش سے کس قسم کا غیر متوازن نظامِ معاشی ان لوگوں نے بنایا اور اُس سے کیا نتائج برآمد ہوئے:

---

(۲)

جدید نظام سرمایہ داری

جیسا کہ ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں، بے قید معیشت کے وسیع المشرب نظریہ پر جس معاشی نظام کی عمارت اُٹھی، اس کا نام اصطلاح میں جدید نظام سرمایہ داری (Modern Capitalism) ہے۔

بے قید معیشت کے اصول اس نظام کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شخصی ملکیت کا حق۔ صرف اُنہی اشیاء کی ملکیت کا حق نہیں جنہیں آدمی خود استعمال کرتا ہے مثلاً کپڑے، برتن، فرنیچر، مکان، سواری، مویشی وغیرہ۔ بلکہ اُن اشیاء کی ملکیت کا حق بھی جن سے آدمی مختلف قسم کی اشیاء ضرورت پیدا کرتا ہے تاکہ انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کرے۔ مثلاً مشین، آلات، زمین، خام مواد وغیرہ پہلی قسم کی چیزوں پر تو بلا نزاع ہر نظام میں انفرادی حقوقِ ملکیت تسلیم کئے جاتے ہیں، لیکن بحث ان دوسری قسم کی اشیاء یعنی ذرائع پیداوار کے معاملہ میں اٹھ کھڑی ہوئی ہے، کہ آیا ان پر بھی انفرادی ملکیت کا حق جائز ہے یا نہیں۔ نظام سرمایہ داری کی اولین امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس حق کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ درحقیقت یہی حق اس نظام کا سنگِ بنیاد ہے۔

(۲) آزادی سعی کا حق۔ یعنی افراد کا یہ حق کہ وہ فرداً فرداً، یا چھوٹے بڑے گروہوں کی شکل میں مل کر اپنے ذرائع کو جس میدانِ عمل میں چاہیں استعمال کریں۔ اس کوشش کے نتیجہ میں جو فوائد حاصل ہوں یا جو نقصانات پہنچیں، دونوں اُنہی کے لئے ہیں۔ نقصان کا خطرہ بھی وہ خود ہی برداشت کریں گے، اور ان کے فائدے پر بھی کوئی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی۔ ان کو پوری آزادی ہے کہ اپنی پیداوار اور اشیاء کی تیاری کو جس قدر چاہیں بڑھائیں یا گھٹائیں، اپنے مال کی جو قیمت چاہیں رکھیں، جتنے آدمیوں سے چاہیں اجرت پر یا تنخواہ پر کام لیں، اپنے کاروبار کے سلسلے میں جو شرائط اور جو ذمہ داریاں چاہیں قبول کریں، اور جو ضابطے چاہیں بنائیں۔ بائع اور مشتری، اجیر اور مستاجر، مالک اور نوکر کے درمیان کاروبار کی حد تک سارے معاملات آزادانہ طے ہونے چاہئیں، اور جن شرائط پر بھی ان کی باہمی قرارداد ہو جائے اسے نافذ ہونا چاہیے۔

(۳) ذاتی نفع کا محرک عمل ہونا۔ نظام سرمایہ داری اشیاءِ ضرورت کی پیداوار اور ترقی کے لئے جس چیز پر انحصار کرتا ہے وہ فائدے کی طمع اور نفع کی امید ہے جو ہر انسان کے اندر فطرۃً موجود ہے اور اسکو سعی و عمل پر ابھارتی ہے۔ نظام سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ انسانی زندگی میں اس سے بہتر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا محرک عمل فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نفع کے امکانات جس قدر کم کر دیں گے اسی قدر آدمی کی جدوجہد اور محنت کم ہو جائے گی۔ نفع کے امکانات کھلے رکھیئے اور ہر شخص کو موقع دیجئے کہ اپنی محنت و قابلیت سے جتنا کما سکتا ہے کمالے، ہر شخص خود زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کام کرنے کی کوشش کرنے لگے گا۔ اس طرح آپ سے آپ پیداوار بڑھیگی، اس کا معیار بھی بلند ہوتا جائے گا، تمام ممکن ذرائع و وسائل استعمال میں آتے چلے جائیں گے، اشیاءِ ضرورت کی بہم رسانی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا اور ذاتی نفع کا لالچ افراد سے اجتماعی مفاد کی وہ خدمت خود ہی لے لیگا جو کسی دوسری طرح اُن سے نہیں لی جاسکتی۔

(۴) مقابلہ اور مسابقت۔ نظام سرمایہ داری کے وکلاء کہتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جو بے قید معیشت میں افراد کی خود غرضی کو بے جا حد تک بڑھنے سے روکتی ہے اور ان کے درمیان اعتدال و توازن قائم کرتی رہتی ہے۔ یہ انتظام فطرت نے خود ہی کر دیا ہے۔ کھلے بازار میں جب ایک ہی جنس کے بہت سے تیار کرنے والے، بہت سے سوداگر اور بہت سے خریدار ہوتے ہیں تو مقابلے میں آکر کسر و انکسار سے خود ہی قیمتوں کا ایک مناسب معیار قائم ہو جاتا ہے اور نفع اندوزی نہ مستقل طور پر حد سے بڑھنے پاتی ہے نہ حد سے گھٹ سکتی ہے، اتفاقی اتار چڑھاؤ کی بات دوسری ہے۔ علیٰ ہذالقیاس کام کرنے والے اور کام لینے والے بھی اپنی اپنی جگہ مقابلے کی بدولت خود ہی اجرتوں اور تنخواہوں کے متوازن معیار قائم کرتے رہتے ہیں بشرطیکہ مقابلہ کھلا اور آزادانہ ہو اور کسی قسم کی اجارہ داریوں سے اسکو تنگ نہ کر دیا جائے۔

(۵) اجیر اور مستاجر کے حقوق کا فرق۔ نظام سرمایہ داری میں ہر کاروباری ادارے کے کارکن دو فریقوں پر منقسم ہوتے ہیں۔ ایک مالک، جو اپنی ذمہ داری پر کسی تجارت یا صنعت کو شروع کرتے ہیں، اور چلاتے ہیں، اور آخر تک اس کے نفع و نقصان کے ذمہ دار رہتے ہیں۔ دوسرے مزدور یا ملازم، جن کو نفع اور نقصان سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، وہ بس اپنا وقت اور اپنی محنت و قابلیت اس کاروبار میں صرف کرتے ہیں اور اس کی ایک طے شدہ اجرت لیتے ہیں۔ بسا اوقات کاروبار میں مسلسل گھاٹا آتا رہتا ہے مگر اجیر اپنی اجرت لئے جاتا ہے۔ بسا اوقات کاروبار بالکل بیٹھ

جاتا ہے جس میں مالک تو بالکل برباد ہو جاتا ہے مگر اجیر کے لئے بس اتنا فرق پڑتا ہے کہ آج اس دوکان یا کارخانے میں کام کر رہا تھا تو کل دوسری جگہ جا کھڑا ہوا۔ نظام سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ معاملہ کی یہ نوعیت آپ ہی یہ بات طے کر دیتی ہے کہ از روئے انصاف کاروبار کا منافع اُس کا حصہ ہے جس کے حصے میں کاروبار کا نقصان آتا ہے اور جو کاروبار کا خطرہ مول لیتا ہے۔ رہا اجیر، تو وہ اپنی مناسب اجرت لینے کا حق دار ہے جو معروف طریقہ پر اس کے کام کی نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے مارکیٹ کی شرح کے مطابق طے ہو جائے۔ اس اجرت کو نہ تو اس دلیل کی بنا پر بڑھنا ہی چاہیئے کہ کاروبار میں منافع ہو رہا ہے، اور نہ اس دلیل سے گھٹنا چاہیئے کہ کاروبار میں گھاٹا آ رہا ہے۔ اجیر کا کام اسکو طے شدہ اجرت کا بہر حال مستحق بناتا ہے، اور بس طے شدہ اجرت ہی کا مستحق بناتا ہے۔ ان اجرتوں میں کمی بیشی اگر ہو گی تو اُس فطری قانون کے تحت ہوتی رہے گی جس کے تحت دوسری تمام اشیاء کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ کام لینے والے کم اور کام کے خواہشمند زیادہ ہوں گے تو اجرتیں آپ سے آپ کم ہوں گی۔ کام کرنے والے کم اور کام لینے والے زیادہ ہو گئے تو اجرتیں خود بڑھ جائیں گی۔ اچھے اور ہوشیار کارکن کا کام آپ سے آپ زیادہ اجرت لائے گا اور کاروبار کا مالک خود اپنے ہی فائدے کی خاطر اسکو انعام اور ترقی دے دے کر خوش کرتا رہے گا۔ خود کارکن بھی جیسی کچھ اجرت پائے گا ویسی ہی وہ کاروبار کی ترقی و بہتری میں جان لڑائے گا۔ مالکوں کی خواہش فطرۃً یہ ہو گی کہ لاگت کم سے کم اور منافع زیادہ سے زیادہ ہو، اس لیئے وہ اجرتیں کم رکھنے پر مائل ہوں گے۔ کارکن فطرۃً یہ چاہیں گے کہ ان کی ضروریات زیادہ سے زیادہ فراغت کے ساتھ پوری ہوں اور ان کا معیار زندگی بھی کچھ نہ کچھ بلند ہوتا رہے، اس لئے وہ ہمیشہ اجرتیں بڑھنے کے خواہشمند رہیں گے۔ اس تضاد سے ایک گونہ کشمکش پیدا ہونی ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن جس طرح دنیا کے ہر معاملہ میں ہوا کرتا ہے، اس معاملہ میں بھی فطری طور پر کسر و انکسار سے ایسی اجرتیں طے ہوتی رہیں گی جو فریقین کے لئے قابل قبول ہوں۔

(۶) ارتقاء کے فطری اسباب پر اعتماد: نظام سرمایہ داری کے وکیل کہتے ہیں کہ جب کاروبار میں منافع کا سارا انحصار ہی اس پر ہے کہ لاگت کم اور پیداوار زیادہ ہو، تو کاروباری آدمی کو اس کا اپنا ہی مفاد اس بات پر مجبور کرتا رہتا ہے کہ پیداوار بڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ بہتر سائنٹفک طریقے اختیار کرے، اپنی مشینوں اور آلات کو زیادہ سے زیادہ اچھی حالت میں رکھے، خام مواد بڑی مقدار میں کم قیمت پر حاصل کرے، اور اپنے کاروبار کے طریقوں کو اور اپنی تنظیمات کو ترقی دینے میں ہر وقت دماغ لڑاتا رہے۔ یہ سب کچھ کسی بیرونی مداخلت اور مصنوعی تدبیر کے بغیر، بے قید معیشت کی اندرونی

منزل خود ہی کراتی چلی جاتی ہے۔ فطرت کے قوانین کثیر التعداد منتشر افراد اور گروہوں کی انفرادی سعی و عمل سے اجتماعی ترقی و خوشحالی کا وہ کام آپ ہی آپ لیتے رہتے ہیں جو کسی اجتماعی منصوبہ بندی سے اتنی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ فطرت کی منصوبہ بندی ہے جو غیر محسوس طور پر عمل میں آتی ہے۔

(۷) ریاست کی عدم مداخلت۔ اس نظام کے حامیوں کا کہنا یہ ہے کہ مذکورۂ بالا اصولوں پر سوسائٹی کی فلاح و بہبود کا بہترین کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ افراد کو بلا کسی قید و بند کے آزادانہ کام کرنے کا موقع حاصل ہو۔ فطرت نے معاشی قوانین میں ایک ایسی ہم آہنگی رکھ دی ہے کہ جب وہ سب مل جل کر کام کرتے ہیں تو نتیجہ میں سب کی بھلائی حاصل ہوتی ہے، حالانکہ ایک ایک فرد اپنے ہی ذاتی نفع کے لئے سعی کر رہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے، جب افراد کو اپنی سعی کا صلہ غیر محدود منافع کی شکل میں ملتا نظر آتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے لئے اپنی ساری قوت و قابلیت صرف کر دیتے ہیں۔ اس سے لامحالہ سب لوگوں کے لئے اچھے سے اچھا مال وافر سے وافر مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ کھلے بازار میں جب تاجروں اور صناعوں اور خام پیداوار بہم پہنچانے والوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو قیمتوں کا اعتدال آپ سے آپ قائم ہوتا ہے، اشیاء کا معیار آپ سے آپ بلند ہوتا جاتا ہے اور خود ہی معلوم ہوتا رہتا ہے کہ سوسائٹی کو کن چیزوں کی کتنی ضرورت ہے۔ اس سارے کاروبار میں ریاست کا کام یہ نہیں ہے کہ پیدائش دولت کے فطری عمل میں خواہ مخواہ مداخلت کرکے اس کا توازن بگاڑے، بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں انفرادی آزادی عمل زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو سکے۔ اسے امن اور نظم قائم کرنا چاہیئے، حقوق ملکیت کی حفاظت کرنی چاہیئے، معاہدوں کو قانون کے زور سے پورا کرانا چاہیئے اور بیرونی حملوں اور مزاحمتوں اور خطروں سے ملک کو اور ملک کے کاروبار کو بچانا چاہیئے۔ ریاست کا منصب یہ ہے کہ منصف اور نگران اور محافظ کی خدمت انجام دے، نہ یہ کہ خود تاجر اور صناع اور زمیندار بن بیٹھے، یا تاجروں اور صناعوں اور زمینداروں کو اپنی بار بار کی دخل اندازی سے کام نہ کرنے دے۔

خرابی کے اسباب | یہ تھے وہ اصول جن کو پورے زور شور کے ساتھ جدید سرمایہ داری کی پیدائش کے زمانہ میں پیش کیا گیا، اور چونکہ ان کے اندر کسی حد تک مبالغہ کے باوجود صداقت پائی جاتی تھی، اس لئے ان کو بالعموم دنیا بھر سے تسلیم کرا لیا گیا۔ درحقیقت ان میں نئی بات کوئی بھی نہ تھی۔ ساری باتیں وہی تھیں جن پر غیر معلوم زمانے سے

انسانی معیشت کا کاروبار انجام پاتا چلا آرہا تھا۔ جدت اگر تھی تو اُس مبالغہ آمیز شدت میں تھی جو بعض اصولوں کو صنعتی انقلاب کے دور کی معیشت پر چسپاں کرنے میں بورژوا حضرات نے اختیار کی۔ مزید برآں انہوں نے اپنا سارا نظام صرف اُن فطری اصولوں ہی پر نہیں اٹھایا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے بلکہ ان کے ساتھ کچھ غلط اصولوں کی آمیزش بھی کر دی۔ پھر انہوں نے بعض دوسرے ایسے اصولوں کو نظر انداز بھی کر دیا جو ایک فطری نظام معیشت کے لئے اُتنے ہی اہم ہیں جتنے آزاد معیشت کے مذکورۂ بالا اصول۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنی خود غرضیوں سے خود اپنے ہی پیش کردہ بعض اصولوں کی نفی بھی کر دی۔ یہی چاروں چیزیں مل جل کر اُن خرابیوں کی موجب ہوئیں جو بالآخر جدید سرمایہ داری میں پیدا ہوتی چلی گئیں اور اس حد تک بڑھیں کہ دنیا میں اس کے خلاف ایک عام شورش برپا ہوگئی۔

مختصراً ہمیں ان اسباب کا بھی جائزہ لے لینا چاہیئے۔

(۱) بے قید معیشت کی حمایت میں جن "فطری قوانین" کا یہ لوگ بار بار حوالہ دیتے رہے ہیں وہ اس مبالغہ کی حد تک صحیح نہیں ہیں جو ان لوگوں نے نہ صرف اپنے بیان میں، بلکہ اپنے عمل میں برتنا چاہا۔ لارڈ کینز نے بالکل سچ کہا ہے کہ "دنیا پر اخلاقی و فطری قوانین کی ایسی مضبوط حکومت قائم نہیں ہے جس کے زور سے افراد کے ذاتی مفاد اور سوسائٹی کے اجتماعی مفاد میں ضرور آپ ہی آپ موافقت ہوتی رہے۔ معاشیات کے اصولوں سے یہ استنباط کوئی صحیح استنباط نہیں ہے کہ روشن خیال خود غرضی ہمیشہ اجتماعی فلاح و بہبود ہی کے لئے کوشش کیا کرتی ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ خود غرضی ہمیشہ روشن خیال ہی ہوا کرتی ہے۔ اکثر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ انفرادی طور پر اپنی اغراض کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ اس قدر نادان یا کمزور ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی اغراض کو بھی پورا نہیں کر سکتے کجا کہ ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت ضرور اور ہمیشہ انجام پاتی رہے۔" صرف یہی نہیں کہ یہ مبالغہ آمیز باتیں عقلاً صحیح نہ تھیں، بلکہ تجربہ سے خود بورژوا سرمایہ داروں کے اپنے عمل نے ثابت کر دیا کہ ان کی خود غرضی روشن خیال نہیں تھی۔ انہوں نے خریدار پبلک، اجرت پیشہ کارکن، اور پر امن حالات پیدا کرنے والی حکومت، تینوں کے مفاد کے خلاف اپنی جتھہ بندی کی اور باہم یہ سازش کر لی کہ صنعتی انقلاب کے سارے فوائد خود لوٹ لیں۔ ان کے اس باہمی ساز باز نے ان کی اُس سب سے بڑی دلیل کو خود ہی توڑ دیا جو وہ آزاد معیشت کے

حق میں مفید ثابت کرتے تھے کہ فطرۃً کسر و انکسار سے خود ہی سب کے درمیان منفعت کا توازن قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر کار آدم سمتھ جیسے شخص کو بھی، جو آزاد معیشت کا سب سے بڑا وکیل تھا، یہ کہنا پڑا کہ:-

"کم ہی ایسا ہوتا ہے جب کاروباری لوگ کہیں باہم جمع ہوں اور ان کی صحبت پبلک کے خلاف کسی سازش پر اور قیمتیں چڑھانے کے لئے کسی قرارداد پر ختم نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ تقریبات تک میں مل بیٹھنے کا جو موقع مل جاتا ہے اسکو بھی یہ حضرات اس جرم سے خالی نہیں جانے دیتے"۔

اسی طرح شخصی ملکیت اور آزادیٔ سعی کے بارے میں ان کے یہ دعوے بھی بالکل مبالغہ آمیز تھے کہ ان عنوانات کے تحت افراد کو کچھ ایسے حقوق حاصل ہیں جن پر کوئی حد عائد نہ ہونی چاہیئے۔ ایک شخص اپنی ملکیت میں اگر ایسے طریقہ سے تصرف کرتا ہے جس سے ہزارہا آدمیوں کی معیشت متأثر ہو جاتی ہے، یا ایک آدمی اگر اپنے ذاتی نفع کے لئے سعی و عمل کی کوئی ایسی راہ نکالتا ہے جس سے پوری سوسائٹی کی صحت، یا اخلاق، یا عافیت پر برا اثر پڑتا ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ اسکو ان کاموں کے لئے کھلی چھٹی دیدی جائے اور قانون ایسے حدود عائد نہ کرے جن سے اس کے انفرادی حقوق کا استعمال اجتماعی مفاد کے لئے مضرت رساں نہ ہونے پائے۔ حکومت کی عدم مداخلت کے مضمون کو ان لوگوں نے اسکی جائز حد سے اتنا زیادہ بڑھا دیا کہ وہ برے نتائج پیدا کیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ جب طاقت ور افراد جتھہ بندی کرکے کثیر التعداد لوگوں سے ناجائز فائدے اٹھانے لگیں اور حکومت یا تو تماشا دیکھتی رہے یا خود ان طاقت ور افراد ہی کے مفاد کی حفاظت کرنے لگے، تو اس کا لازمی نتیجہ شورش ہے، اور شورش جب برپا ہو جاتی ہے تو ہمیشہ اپنے ظہور کے لئے معقول راستوں ہی کی پابندی نہیں کیا کرتی۔

(۲) خصوصیت کے ساتھ صنعتی انقلاب کے دور میں بے قید معیشت کے اصولوں کا اتنا سخت مبالغہ اور بھی زیادہ غلط تھا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے طریق پیداوار میں جو بنیادی تغیر واقع ہو گیا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے جو کام انسانی اور حیوانی طاقت سے کیئے جاتے تھے اب ان کے لئے مشین کی طاقت استعمال کی جانے لگی۔ ایک مشین لگا لینے کے معنی یہ ہو گئے کہ دس آدمی وہ کام کرنے لگیں جو پہلے ہزار آدمی کرتے تھے۔ اس طریق پیداوار کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ چند انسانوں کو کام پر لگا کر ہزاروں انسانوں کو بیکار کر دیتا ہے۔ ایسے ایک طریقہ کے متعلق ملکیت اور آزادیٔ سعی کے مطلق حقوق کا دعوےٰ اور حکومت کی عدم مداخلت کا مطالبہ اصولاً بالکل بے جا تھا۔

آخر یہ کس طرح جائز ہو سکتا تھا کہ ایک شخص یا گروہ محض اس وجہ سے کہ وہ ایسا کرنے کے ذرائع رکھتا ہے ایک خاص قسم کا مال تیار کرنے کے لئے اچانک ایک بڑا کارخانہ قائم کردے اور اس کی کچھ پرواہ نہ کرے کہ اس کی اس حرکت سے پورے علاقے کے ان ہزارہا آدمیوں کے روزگار پر کیا اثر پڑتا ہے جو پہلے اپنے گھروں اور دوکانوں میں یا دستی کاریگری کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں میں بیٹھے وہی مال تیار کر رہے تھے؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشین کی طاقت کو صنعت میں استعمال نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس طاقت کے استعمال کی اندھا دھند اجازت نہ ہونی چاہیئے تھی اور حکومت کو اوّل روز ہی سے یہ فکر کرنی چاہیئے تھی کہ ساتھ ساتھ ان لوگوں کے روزگار کا بندوبست بھی ہوتا جائے جن کو یہ نئی صنعتی طاقت بیکار کر رہی تھی۔ چونکہ ایسا نہیں ہوا اسی وجہ سے مشینی طریق پیداوار کے وجود میں آتے ہی انسانی سوسائٹی میں بے روزگاری کا ایک مستقل مسئلہ اتنے بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا جس سے تاریخ پہلے کبھی آشنا نہ ہوئی تھی۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ بے روزگاری کسی ایک مسئلہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی مادّی، روحانی، اخلاقی اور تمدنی زندگی کے بے شمار پیچیدہ مسائل کا مورث اعلیٰ ہے سوال یہ ہے کہ ایک فرد یا چند افراد کو کیا حق ہے کہ اپنی ملکیت میں ایسے طریقہ سے تصرف کریں جس سے اجتماعی زندگی میں اتنی زبردست پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں؟ اور اس طرح کے تصرف کے بارے میں کوئی مرد عاقل یہ کیسے دعوٰے کر سکتا ہے کہ یہ افراد کی وہ روشن خیال خودغرضی ہے جو آپ سے آپ اجتماعی مفاد کی خدمت کرتی رہتی ہے؟ اور ایسے انفرادی تصرفات کے معاملہ میں یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے کہ قومی حکومت کو اس کا کھلا لائسنس دے کر خاموش بیٹھ جانا چاہیئے اور ان اثرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینی چاہئیں جو ایک قلیل التعداد گروہ کی کارروائیوں سے پوری قوم کی زندگی پر پڑ رہے ہوں؟

(۳) پھر اس طریق پیداوار نے جب ہزارہا بلکہ لکھوکھا آدمیوں کو بے روزگار کر دیا اور وہ مجبور ہو گئے کہ اپنے دیہات اور قصبات سے اور اپنے محلوں اور گلیوں سے نکل نکل کر ان بڑے کارخانہ داروں اور تاجروں کے پاس مزدوری یا نوکری کی تلاش کرتے ہوئے آئیں، تو لامحالہ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا اور یہی ہوا کہ یہ بھوکے مرتے ہوئے طالبینِ روزگار ان کم سے کم اجرتوں پر کام کرنے کے لئے مجبور ہو گئے جو سرمایہ داروں نے ان کے سامنے پیش کیں۔ کام ان سب کو نہ ملا، بلکہ قابلِ کار آدمیوں کا ایک حصہ مستقلاً بیکار رہا۔ پھر جنہیں کام ملا بھی وہ اس

پوزیشن میں نہ تھے کہ سرمایہ دار سے سودا چکا کر بہتر شرائط منوا سکتے، کیونکہ وہ تو خود طالب روزگار ہو کر آئے تھے۔ سرمایہ دار کی پیش کردہ شرائط قبول نہ کرتے تو شام کی روٹی تک کا بندوبست ان کے پاس نہ تھا، اور اس پر بھی کچھ اکڑ دکھلاتے تو دوسرے ہزاروں بھوکے جھپٹ کر انہی شرائط پر یہ روزگار اچک لینے کے لئے تیار تھے۔ اس طرح بورژوا حضرات کا وہ سارا استدلال غلط ثابت ہو گیا جو وہ اس اصول کے حق میں پیش کرتے تھے کہ کھلے مقابلے میں اجیر اور مستاجر کے درمیان کسر و انکسار سے مناسب اور منصفانہ اجرتیں آپ ہی آپ طے ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں حقیقت میں مقابلے کے ساتھ اس کے کھلے ہونے کی شرط مفقود تھی۔ یہاں یہ صورت تھی کہ ایک آدمی نے ہزاروں آدمیوں کا رزق چھین کر پہلے اپنے قابو میں کر لیا۔ اور جب وہ بھوک سے تڑپ کر اس کے پاس آئے تو وہ اُن سب کو نہیں بلکہ ان کے صرف دسویں یا بیسویں حصہ کو کام دینے پر راضی ہوا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ سودا چکانے کی ساری طاقت اس ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی اور ان ہزاروں طالبین روزگار میں سے کوئی بھی اپنی شرائط منوانے کے قابل نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعتی انقلاب کے دور میں جدید سرمایہ داری جیسی جیسی بڑھتی گئی، سوسائٹی میں بے روزگاری کے علاوہ افلاس اور خستہ حالی کی مصیبت بھی بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے صنعتی و تجارتی مرکزوں میں جو لوگ محنت مزدوری اور نوکری کے لئے جمع ہوئے انہیں بہت کم اجرتوں پر بہت زیادہ وقت اور محنت کرنے پر راضی ہونا پڑا۔ وہ جانوروں کی طرح کام کرنے لگے۔ جانوروں سے بدتر حالت میں شہروں کے تنگ و تاریک مکانات میں رہنے لگے۔ ان کی صحتیں برباد ہونے لگیں۔ ان کی ذہنیتیں پست ہونے لگیں۔ ان کے اخلاق بری طرح بگڑنے شروع ہو گئے۔ نفسی نفسی کے عالم میں باپ بیٹے اور بھائی بھائی تک کے درمیان ہمدردی باقی نہ رہی۔ والدین کے لئے اولاد اور شوہروں کے لئے بیویاں تک وبال جان بن گئیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہا جو اس غلط اور یک رخی قسم کی آزاد معیشت کے برے اثرات سے بچا رہ گیا ہو۔

(۴) اس پر مزید لطف یہ ہے کہ یہی بورژوا حضرات، جو وسیع المشربی اور جمہوریت کے زبردست داعی تھے، اور جنہوں نے لڑ بھڑ کر مالکانِ زمین کے مقابلہ میں اپنا ووٹ کا حق تسلیم کرایا تھا، اس بات کے لئے تیار نہ تھے کہ یہی ووٹ کا حق اُن لاکھوں کروڑوں عوام کو بھی حاصل ہو جن کی روزی کے یہ مالک بن گئے تھے۔

وہ اپنے لیئے تو یہ حق سمجھتے تھے کہ ایک ایک پیشے کے مالکانِ کاروبار اپنی اپنی انجمنیں بنائیں اور باہمی قرار داد سے اشیاء کی قیمتیں، نوکروں کی تنخواہیں اور مزدوروں کی اجرتیں تجویز کریں۔ لیکن وہ نوکروں اور مزدوروں کا یہ حق ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ بھی منظم ہوں اور اجتماعی قوت سے اجرتوں اور تنخواہوں کے لئے سودا چکائیں۔ حد یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے اس حق پر بھی اصرار تھا کہ وہ جب چاہیں کارخانہ بند کرکے ہزار ہا ملازموں اور مزدوروں کو بیک وقت بیکار کردیں اور اس طرح انہیں بھوکا مار کر کم اجرتوں پر راضی ہونے کے لئے مجبور کریں۔ مگر وہ نوکروں اور مزدوروں کا یہ حق تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے کہ وہ بھی ہڑتال کرکے اپنی اجرتیں بڑھوانے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ یہ حضرات اس بات کو سراسر جائز سمجھتے تھے کہ جو شخص انہی کے کارخانے یا تجارتی ادارے میں خدمت کرتے کرتے بوڑھا، یا بیمار، یا کسی طور پر از کار رفتہ ہوگیا ہو اسے وہ رخصت کردیں، اگر وہ شخص جو رخصت کیا جارہا ہو، اسکی یہ گذارش ان کے نزدیک بالکل نارواتھی کہ حضور! صحت، طاقت، جوانی سب کچھ تو آپ کے کاروبار کی ترقی میں کھپا بیٹھا، اب اس جانِ ناتواں کو کہاں لے جاؤں اور ہاتھ پاؤں کی قوت کھودینے کے بعد جو پیٹ بچا رہ گیا ہے اسے کس طرح بھروں؟ یہاں پہنچ کر خود حضرات اپنے اس استدلال کو بھی بالکل بھول گئے جو وہ ذاتی مفاد کو ایک ہی صحیح محرکِ عمل قرار دینے کے حق میں پیش کرتے تھے۔ انہیں اپنے متعلق تو یہ یاد رہا کہ اگر ان کے لئے نفع کے امکانات غیر محدود ہوں گے تو وہ خوب کام کریں گے اور اس طرح اجتماعی ترقی و خوشحالی کی خدمت آپ سے آپ انجام پائیگی۔ لیکن اپنے نوکروں اور مزدوروں کے معاملہ میں وہ بھول گئے کہ جس کا نفع محدود ہی نہیں بلکہ تنگ ہو، اور جس کا حال خراب اور مستقبل تاریک ہو وہ آخر کیوں دل لگا کر اور جان لڑا کر کام کرے اور کس بنا پر اپنے کام میں دلچسپی لے؟

(۵) علاوہ بریں ان لوگوں نے کاروبار کے فطری اور معقول طریقوں سے ہٹ کر اپنے ذاتی مفاد کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنے شروع کردیئے جو صریحًا اجتماعی مفاد کے خلاف ہیں اور جن سے مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھتی ہیں اور جن سے دولت کی پیداوار رکتی اور ترقی کی رفتار سست ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر:-

یہ طریقہ کہ اپنے سرمائے کے زور سے اشیاء ضرورت کو خرید خرید کر ان کے کھتے بھرتے چلے جائیں یہاں تک کہ بازار میں ان کی رسد کم اور مانگ بڑھ جائے اور اس طرح قیمتیں مصنوعی طور پر گراں کی جاسکیں۔

اور یہ طریقہ کہ مال پیدا کرنے والے اور اصل استعمال کرنے والے کے درمیان سینکڑوں آدمی محض اپنے بینک کے روپے اور ٹیلیفون کے بل پر اس کو غائبانہ بیچتے اور خریدتے چلے جائیں اور اس طرح زبردستی اُن کا منافع لگ لگ کر اسکی قیمت بڑھتی رہے بغیر اس کے کہ ان بیچ والوں نے اس مال کے پیدا کرنے یا ڈھونے یا اسے کارآمد بنانے کی کوئی خدمت انجام دی ہو جس کی بناپر وہ منافع میں حصہ لینے کے جائز حقدار ہوں۔

اور یہ طریقہ کہ پیداشدہ مال کو محض اس اندیشہ سے جلا دیا جائے یا سمندر میں پھینک دیا جائے کہ اتنی بڑی مقدار مِل کے منڈی میں پہنچ جانے سے قیمتیں گر جائیں گی۔

اور یہ طریقہ کہ وافر سرمایہ کے بل پر ایک چیز از قسم سامانِ تعیش تیار کی جائے اور پھر اشتہار سے، ترغیب سے، مفت بانٹ بانٹ کر، طرح طرح کی سخن سازیاں کر کے زبردستی اسکی مانگ پیدا کی جائے اور اُسے اُن غریب اور متوسط الحال لوگوں کی ضرریاتِ زندگی میں خواہ مخواہ ٹھونس دیا جائے جو بیچارے اپنے فرائض حیات بھی پوری طرح بجا لانے کے قابل نہیں ہیں۔

اور یہ طریقہ کہ عامۃ الناس کو حقیقۃً جن چیزوں کی ضرورت اور شدید ضرورت ہے ان کی فراہمی پر تو سرمایہ اور محنت صرف نہ ہو اور اُن کاموں پر وہ بے دریغ صرف کیا جائے جو بالکل غیر ضروری ہیں، صرف اس لیئے کہ پہلی قسم کے کاموں کی بہ نسبت یہ دوسرے کام زیادہ نفع آور ہیں۔

اور یہ طریقہ کہ ایک شخص یا گروہ نہایت مضر صحت اور مخرّبِ اخلاق اور مفسدِ تہذیب وتمدن چیزوں کو اپنے سرمائے کے زور سے خوشنما اور دلفریب بنا بنا کر لائے اور علانیہ پبلک کے سفلی جذبات کو اپیل کر کر کے انہیں اپنے اس کاروبار کی طرف کھینچے اور ان کو دیوانہ بنا بنا کر ان کی قلیل آمدنیوں کا بھی ایک معتدبہ حصہ ٹٹولے درانحالیکہ ان غریبوں کی آمدنیاں ان کا اور ان کے بال بچّوں کا پیٹ بھرنے تک کے لئے کافی نہ ہوں۔

اور سب سے بڑھ کر خطرناک اور تباہ کن یہ طریقہ کہ اپنے تجارتی اور مالی مفاد کے لئے کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈالے جائیں، اور دنیا کو مختلف حلقہائے اثر میں تقسیم کیا جائے، اور ہر قوم کے بڑے بڑے ساہوکار اور صناع اور تاجر اپنی اپنی قوموں کو اپنی حد سے بڑھی ہوئی اغراض کا آلہ کار بنا کر ایک دوسرے کے خلاف ایسی دائمی کشمکش میں الجھا دیں جو نہ میدان جنگ میں سلجھنے پائے نہ ایوان صلح میں۔

کیا یہ سب واقعی اس بات کے ثبوت ہیں کہ اگر افراد کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے بے روک ٹوک کام کرنے دیا جائے تو ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت خود بخود انجام پاتی رہتی ہے؟ اس طرح تو دراصل انہوں نے اپنے عمل سے خود یہ ثابت کر دکھایا کہ بے قید خود غرضی بہت ہی کم روشن خیال ہوتی ہے، خصوصاً جب کہ معاشی و سیاسی طاقت بھی اسی کے ہاتھ میں مرتکز ہو جائے اور قانون ساز بھی وہ خود ہی ہو۔ ایسے حالات میں تو اس کی بیشتر کوششیں اجتماعی مفاد کی خدمت میں نہیں بلکہ اس راہ میں صرف ہونے لگتی ہیں کہ جماعت کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر بھینٹ چڑھا دے۔

(۷) ان سب حرکات پر مزید غضب انہوں نے یہ کیا کہ افراد کے لئے اس بات کو بالکل جائز اور معقول اور برحق ٹھہرایا کہ وہ سرمایہ کو جمع کر کے اسے سود پر چلائیں۔ سود ایک قابل نفرت برائی کی حیثیت سے تو دنیا کے اکثر معاشروں میں ہمیشہ موجود رہا ہے اور دنیا کے قوانین نے بھی بسا اوقات اس کو بکراہت گوارا کیا ہے لیکن قدیم جاہلیت عرب کے بعد یہ فخر صرف جدید جاہلیتِ غرب کے بورژوا مفکرین کو حاصل ہوا کہ انہوں نے اسے کاروبار کی ایک ہی معقول صورت اور پورے نظام مالیات کی ایک ہی صحیح بنیاد بنا کر چھوڑا، اور ملکی قوانین کو اس طرز پر ڈھالا کہ وہ قرضدار کے بجائے سودخوار کے مفاد کی پشت پناہ بن گئے۔ اس عظیم الشان غلطی پر اور اس کے نتائج پر تو ہم آگے چل کر ایک مستقل باب میں بحث کریں گے۔ یہاں اس سلسلۂ کلام میں مختصراً صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ سود کو قرض و استقراض اور مالی لین دین کی بنیاد بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے روک ٹوک صنعتی انقلاب کی وجہ سے طاقت، دولت، رسوخ و اثر اور تمام فوائد و منافع کا جو بہاؤ پہلے ہی ایک رخ پر چل پڑا تھا وہ اس کارروائی کی وجہ سے اور زیادہ یک رخا ہو گیا اور اسکی بدولت اجتماعی زندگی کا عدم توازن اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اب سوسائٹی میں سب سے زیادہ خوش قسمت وہ لوگ ہو گئے جو کسی نہ کسی ترکیب سے کچھ سرمایہ اکٹھا کر کے بیٹھ گئے ہوں۔ دماغی قابلیت رکھنے والے، محنت کرنے والے، کاروباری اسکیمیں سوچنے اور اس کی تنظیم کرنے والے، اپنی جان کھپا کر کاروبار کو ہر مرحلے میں چلانے والے، اور اشیاء ضرورت کی تیاری و فراہمی کے سلسلے کی ساری خدمات انجام دینے والے، غرض سب کے سب اُس ایک آدمی کے سامنے ہیچ ہو گئے جو کاروبار میں روپیہ قرض دے کر اطمینان سے گھر بیٹھا ہوا ہو۔ ان سب کا نفع غیر معین اور غیر یقینی ہے اور اس کا نفع معین اور یقینی۔ ان سب کے لئے نقصان

کا خطرہ بھی ہے مگر اس کے لئے خالص منافع کی گارنٹی۔ یہ سب کاروبار کے بھلے اور برے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہیں، اور وہ ہر چیز سے بے پرواصرف اپنے سود سے غرض رکھتا ہے۔ کاروبار فروغ پاتا نظر آئے تو وہ بے تحاشا اس میں سرمایہ لگانا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ نفع کے امکانات ختم ہونے لگتے ہیں۔ کاروبار سر دپڑتا نظر آئے تو وہ مدد کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاتا بلکہ پہلے کا لگا ہوا سرمایہ بھی کھینچنے لگتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا پہ سخت کساد بازاری کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ ہر حال میں نقصان، زحمت، خطرے سب کچھ دوسروں کے لئے ہیں اور اس کے لئے حد سے حد اگر کوئی اتار چڑھاؤ ہے تو وہ صرف نفع کی کمی بیشی کا۔ تاجر اور صناع اور زمیندار ہی نہیں، حکومتیں تک اس کی مزدوری ہوئی ہیں۔ اس کے دیئے ہوئے روپے سے وہ سڑکیں، ریلیں، نہریں اور دوسری چیزیں بناتی ہیں اور برسوں نہیں، صدیوں، ایک ایک شخص سے ٹیکس وصول کر کر کے اس کا سود اس کے گھر پہنچاتی رہتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ قوم کو اگر کوئی لڑائی پیش آجاتی ہے تو جس کی جان جائے، یا جس کے ہاتھ پاؤں کٹیں، یا جس کا گھر برباد ہو، یا جو اپنے باپ، بیٹے یا شوہر سے محروم ہوں، ان سب کے بارے تو قومی خزانہ بآسانی سبکدوش ہو جاتا ہے، لیکن قوم ہی کے جن چند افراد نے لڑائی کے لئے سرمایہ قرض دے دیا ہو ان کا سود سو سوا اور دو دو سو برس تک ادا کیا جاتا رہتا ہے اور اس سود کی ادائیگی میں اُن لوگوں تک کو "چندہ" دینا پڑتا ہے جنہوں نے اسی جنگ میں جانیں قربان کی تھیں۔ اس طرح یہ سودی نظام مالیات سوسائٹی کی دولت پیدا کرنے والے اصل عاملین کے ساتھ ہر طرح، ہر جہت میں ایک ہمہ گیر بے انصافی کرتا ہے۔ اس نے ساری اجتماعی معیشت کی باگیں چند خود غرض سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دی ہیں جو نہ تو اجتماع کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں، نہ فی الواقع اجتماع کی کوئی خدمت ہی انجام دیتے ہیں، مگر چونکہ پورے معاشی کاروبار کی جان، یعنی سرمایہ ان کے قبضہ میں ہے اور قانون نے ان کو اسے روک رکھنے اور سود پر چلانے کے اختیارات دے رکھے ہیں، اس لئے وہ صرف یہی نہیں کہ اجتماع کی مجموعی محنت سے پیدا ہونے والی دولت کے شریک غالب بن گئے ہیں، بلکہ ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ پورے اجتماع کو اپنے مفاد کا خادم بنالیں اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں سے کھیلتے رہیں۔

(۷) جدید سرمایہ داری کی ان بنیادوں پر جو نیا معاشرہ وجود میں آیا وہ ہمدردی، تعاون، رحم، شفقت اور اس نوع کے تمام جذبات سے عاری اور اس کے برعکس صفات سے لبریز تھا۔ اس نظام میں غیر تو غیر، بھائی پر

بھی بھائی کا یہ حق نہ رہا کہ وہ اسے سہارا دے۔ ایک طرف ہر نئی مشین کی ایجاد سینکڑوں اور ہزاروں کو بیک وقت بیکار کیئے دے رہی تھی، اور دوسری طرف حکومت، سوسائٹی، کارخانہ دار یا ساہوکار کسی کی بھی یہ ذمہ داری نہ تھی کہ جو لوگ بے روزگار ہو جائیں، یا کام کرنے کے قابل نہ ہوں، یا ناکارہ ہو جائیں، ان کی بسر اوقات کا کوئی بندوبست کرے۔ یہی نہیں بلکہ اس نئے نظام نے ایسے حالات پیدا کردیئے اور ایسے اخلاقیات بھی عام لوگوں کے اندر اُبھار دیئے کہ کسی گرے ہوئے یا گرتے ہوئے انسان کو سنبھالنا کسی کا فرض ہی نہ رہا۔ حوادث، بیماری، موت، اور تمام دوسرے ناموافق حالات کے لیئے اس نظام نے جتنے علاج بھی تجویز کیئے، اُن لوگوں کے لیئے کیئے جو فی الوقت کما رہے ہوں، اور اپنی موجودہ ضروریات سے اتنا زیادہ کما رہے ہوں کہ کچھ پس انداز کرسکیں۔ لیکن جو کما ہی نہ رہا ہو، یا بس بقدرِ سدِّ رمق کما رہا ہو وہ اپنے برے وقت پر کہاں سے مدد پائے؟ اس کا کوئی جواب جدید سرمایہ داری کے پاس اس کے سوا نہیں ہے کہ ایسا شخص مہاجن کے پاس جائے اور اپنے پہننے کے کپڑے یا گھر کے برتن یا جورو کا زیور رہن رکھ کر تین تین سو فی صدی سالانہ سود پر قرض لے، اور جب یہ قرض مع سود ادا نہ ہو سکے تو پھر اُسی مہاجن سے اسی کا قرض و سود ادا کرنے کے لیئے مزید سودی قرض لے لے!

(۸) ظاہر ہے کہ جب سوسائٹی میں لاکھوں آدمی بے روزگار ہوں، اور کروڑوں اس قدر قلیل المعاش ہوں کہ سخت حاجت مند ہونے کے باوجود وہ مال نہ خرید سکیں جو دوکانوں میں بھرا پڑا ہو، تو صنعت اور تجارت کو پورا پورا ممکن فروغ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ عجیب و غریب صورت حال دیکھ رہے ہیں کہ اگرچہ ابھی دنیا میں بے حد و حساب قابل استعمال ذرائع موجود ہیں، اور کروڑوں آدمی کام کرنے کے قابل بھی موجود ہیں، اور وہ انسان بھی کروڑہا کروڑ کی تعداد میں موجود ہیں جو اشیاء ضرورت کے محتاج اور اشیاء عیش و رفاہیت خریدنے کے خواہش مند ہیں، مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دنیا کے کارخانے اپنی استعداد کار سے بہت گھٹ کر جو مال تیار کرتے ہیں وہ بھی منڈیوں میں اس لئے پڑا رہ جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس خریدنے کو روپیہ موجود نہیں، اور لاکھوں بے روزگار آدمیوں کو کام پر اس لئے نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ جو تھوڑا مال بنتا ہے وہی بازار میں نہیں نکلتا، اور سرمایہ اور قدرتی ذرائع بھی پوری طرح زیر استعمال اس لئے نہیں آنے پاتے کہ جس قلیل پیمانے پر وہ استعمال میں آرہے ہیں اسی کا بار آور ہونا مشکل ہو رہا ہے کجا کہ مزید ذرائع کی ترقی پر مزید سرمایہ لگانے کی

کوئی ہمت کر سکے۔ یہ صورت حال بورژوا مفکرین کے اُس استدلال کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ بے قید معیشت میں اپنے انفرادی نفع کے لئے افراد کی تگ و دو خود بخود ذرائع و وسائل کی ترقی اور پیداوار کی افزائش کا سامان کرتی رہتی ہے۔ ترقی اور افزائش تو درکنار، یہاں تو تجربے سے یہ ثابت ہوا کہ انہوں نے اپنی نادانی سے خود اپنے منافع کے راستے میں بھی روکاوٹیں پیدا کر لیں۔ (باقی آئندہ)

ہندوستان کے خریداروں کی خدمت میں گذارش

انڈیا کے جو باشندے رسالہ ترجمان القرآن کے خریدار ہیں۔ اُن کے لئے گذارش ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے تحت رسالے کا سالانہ چندہ مبلغ ساڑھے سات روپے فی پرچہ گیارہ آنے کر دیا گیا ہے۔ جب تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان منی آرڈر یا وی پی کا سلسلہ بند ہے اس وقت تک وہ اپنی رقوم ان تین مراکز الہ آباد۔ حیدرآباد دکن اور بھوپال کو روانہ کریں۔ نئے خریدار بھی انہیں جگہوں پر اپنے چندے بھیجیں۔ پتے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ الہ آباد۔ جناب حکیم محمد خالد صاحب، ڈاکخانہ ہرواره۔ الہ آباد۔ یوپی

۲۔ حیدرآباد دکن۔ جناب سید عبدالقادر صاحب، مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔

۳۔ بھوپال۔ جناب سید ظہیر الحسن صاحب مکتبہ جماعت اسلامی نور محل بھوپال۔

(۱) الہ آباد۔ یوپی۔ سی۔ پی۔ دہلی۔ راجپوتانہ۔ مغربی بنگال۔ اوڑیسہ۔ بہار۔ بھوٹان۔ نیپال آسام۔

۲۔ حیدرآباد دکن۔ حیدرآباد دکن۔ میسور۔ مدراس۔ ٹراونکور۔ ساحل مالابار۔

۳۔ بھوپال۔ بھوپال۔ وسط ہند کی ریاستیں۔ صوبہ متوسط۔ بمبئی۔ گجرات۔ برار۔

چندے اپنے حلقے کے مرکز کو روانہ کیے جائیں۔ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر مکمل پتہ اور نمبر خریداری ضرور تحریر کیا جائے۔ نیز جس وقت دونوں حکومتوں میں مفاہمت ہو جائے تو اس وقت براہ راست رقمیں دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور کو ارسال کرنی شروع کر دیں۔

(منیجر دفتر رسالہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور)

قیادت کا اسلامی معیار

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

(۲)

قیادت کا ایجابی معیار اس سلبی معیار کے بعد قیادت کے ایجابی معیار کے لئے کتاب وسنت کی جو تصریحات ملتی ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

(۱) وانی ابتلی ابراھیم سابقہ کا مدعا یہ ہے کہ منصب قیادت کے اہل وہ ہیں جو ہر قربانی اور ایثار کے لئے تیار رہیں۔ اپنے نصب العین کیخاطر ہر قسم کے جانی مالی خطرہ کو انگیز کرنے پر آمادہ ہوں۔ جو تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہے ہوں۔

(۲) ان خیر من استاجرت القوی الامین	بیشک جنہیں آپ ملازم رکھیں ان میں بہتر وہ ہے
(پ ۲۰ سورہ قصص آیت ۲۶)	جو صاحب قوت اور امانت دار ہو۔

اسلام میں حاکم اور خلیفہ کی حیثیت مسلمانوں کے اجیر اور ملازم سے زیادہ نہیں ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ دھوپ میں کھڑے ہوئے صدقے کے اونٹوں کا حلیہ قلمبند کرا رہے تھے حضرت علی نے آپکی اس مشقت ومحنت کو دیکھتے ہوئے فرمایا یہ آیت تو آپ پر صادق آتی ہے "ان خیر من استاجرت القوی الامین" (ابن سعد)

غالباً اسی آیت سے استنباط کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

الولایۃ لھا رکنان، القوۃ والامانۃ فالقوۃ	حکومت کے دو ستون ہیں قوت اور امانت، حکم و
فی الحکم ترجع الی العلم بالعدل بتنفیذ الحکم	فیصلہ میں قوت کے معنی یہ ہیں کہ عدل وانصاف اور
والامانۃ ترجع الی خشیۃ اللہ (الاختیارات العلمیۃ ۱۰۹)	قانون کے نفاذ کا علم ہو اور امانت کی بنیاد یہ ہو کہ سینہ
	اللہ کے ڈر سے بھرپور ہو۔

آیت سے معلوم ہوا کہ محض دیانت وامانت ہی کافی نہیں ہے بلکہ جو منصب سونپا گیا ہے اس کے فرائض کو ادا کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ اسی کو یہاں قوت سے تعبیر کیا گیا ہے اور حضرت طالوت کے واقعہ

میں اسے زیادۃ فی الجسم کہا گیا ہے۔ کیونکہ سپہ سالاری اور فوج کی کمان کیلئے جسمانی وجاہت زیادہ موزوں ہے۔ اور اسی مفہوم کو سورہ یوسف میں انی حفیظ علیم کے پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔

(۳) وجعلنا هم ائمة يهدون بامرنا واوحينا اليهم فعل الخيرات اقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة وكانوا لنا عابدين (پ ۱۷، سورہ الانبیاء)

اور ہم نے ان (انبیاء کرام) کو رہنما بنایا ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہم نے انہیں بھلائیوں کے کرنے، اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے۔

(۴) انهم كانوا يسارعون في الخيرات ويدعوننا رغبا ورهبا وكانوا لنا خاشعين (پ ۱۷ سورہ الانبیاء)

بیشک وہ (انبیاء کرام) نیکیوں میں سبقت کرتے رہتے اور ہمیں خوف وطمع سے پکارتے تھے اور وہ ہمارے آگے جھکنے والے تھے۔

(۵) وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا وكانوا باياتنا يوقنون (پ ۲۱ سورہ سجدہ)

اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے قائد ورہنما بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے ہیں جب انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔

(۶) اتبعوا من لا يسئلكم اجرا وهم مهتدون (پ ۲۰۔ سورہ یٰسین)

پیروی کرو انکی جو تم سے (تبلیغ کے لئے) اجرت طلب نہیں کرتے اور وہ راہ یاب ہیں۔

ان آیات سے صالح قیادت کے مندرجہ ذیل اوصاف معلوم ہوتے ہیں۔ انہی اوصاف کی روشنی میں مسلمانوں کو آئندہ اپنے قائدین کا انتخاب کرنا ہوگا۔

(۱) ہدایت یافتہ ہونا (۲) حکم الٰہی کے مطابق رہنمائی (۳) نیکیوں میں سبقت (۴) عاجزی اور انکساری کے ساتھ رب کی غلامی اور عبدیت کا اعتراف (۵) خدا کے حضور خوف وطمع کے ساتھ پکار (۶) آیات الٰہی پر یقین (۷) صبر (۸) دین حق کی اشاعت، انسانیت کی خدمت محض رضائے الٰہی کیلئے اور اجرت ومزدوری سے بے نیازی (۹) نماز کا قیام (۱۰) اداء زکوٰۃ۔

ان دس اوصاف میں سے کوئی بھی وصف ایسا نہیں ہے جو تشریح طلب ہو[1]

[1] صبر کے مفہوم کی مختصر وضاحت کردیجاتی ہے جسے قیادت کے اوصاف میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسکے بغیر کوئی لیڈر شپ کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ صبر کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ مصیبتوں اور صدموں کے موقعہ پر زبان واعضاء کو آہ وزاری اور سینہ کوبی سے بچایا جائے بلکہ یہ اپنے وسیع تر مفہوم اپنے اندر رکھے ہوئے ہے۔ جذبات وخواہشات پر پورا پورا قابو، اشتعال انگیز مواقع پر ضبط نفس، جلد بازی، گھبراہٹ، خوف وہراس، طمع اور بے موقع جوش سے اجتناب، خطرات ومشکلات کی برداشت، نیم پختہ اور سرسری تدابیر اور دنیوی لذتوں اور آسائشوں میں انہماک سے پرہیز۔

(۲) وآتاه الله الملك والحكمة وعلّمه مما يشاء (پ البقرہ آیۃ ۲۵۱) اور اللہ نے اس (داؤد علیہ السلام) کو ملک اور حکمت بخشی اور جو چاہا اسے سکھایا

اس آیت میں صالح قیادت کے دو وصف بتائے گئے ہیں۔

علم یعنی دین و شریعت کی معرفت، حکمت، یعنی احکام الٰہی کے عملی نفاذ کی بصیرت، انتظام ملک کی صلاحیت، وقت کے فتنوں سے واقفیت اور ان پر مؤثر اور مدلل تنقید کی استعداد!

یہاں یہ بھی واضح ہے کہ جو قیادت دین سے واقف ہو لیکن وقت کے تقاضوں اور فتنوں سے بےخبر ہو وہ زیادہ دیر تک حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتی بہر حال اُسے پسپا ہونا پڑے گا۔ اور وقت کی دوسری تحریکیں اس پر غالب آ کر رہینگی۔ اپنے دور کی باطل تحریکات سے باخبر رہنے کی اہمیت خود قرآن حکیم سے واضح ہے:۔

كذلك نفصل الآيات ولتستبين سبيل المجرمين (پ سورۂ انعام آیۃ ۵۵) اسی طرح ہم آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں (اور) تاکہ مجرموں کی راہ واضح ہو جائے

یعنی مسلمانوں کو بالعموم اور انکے اکابر کو بالخصوص دنیا کی غلط کار قوموں کے اصول و مسائل اور تہذیب و سیاست کا بھی پورا پورا علم ہونا چاہیے، لیکن نہ اس لیے کہ ان کی نقل اتاری جائے بلکہ اس لئے کہ انکے غلط طریقوں کا توڑ کیا جائے۔

انما يعمر مساجد الله من آمن بالله واليوم
الآخر وأقام الصلوٰة وآتى الزكوٰة ولم يخش
إلا الله فعسى أولئك أن يكونوا من المهتدين۔
أجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجد الحرام
كمن آمن بالله واليوم الآخر وجاهد
في سبيل الله لا يستوون عند الله
والله لا يهدي القوم الظالمين۔
(پ ۱۰ - سورہ توبہ آیت ۱۹)

بس مسجدوں کے آباد کار وہی لوگ ہیں جو اللہ
اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نماز قائم اور زکوٰۃ
ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سوا (کسی سے) نہیں ڈرتے
پس توقع ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔ کیا
تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی آبادکاری
کو اللہ یوم آخرت پر ایمان لانے اور جہاد فی سبیل اللہ
کے برابر ٹھہرا دیا ہے، اللہ کے ہاں برابر نہیں ہو سکتے اور
اللہ ظالم قوم کو راہ نہیں دکھاتا۔

عمارت مسجد کے دو مفہوم ہیں (۱) نماز اور ذکر الٰہی سے آباد کاری (۲) مساجد کی تولیت یا سبانی (مفردات راغب ص ۳۵۳)

اس دوسرے مفہوم کے لحاظ سے مساجد کی تولیت کا حق سوائے صالحین کے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسلام میں سیاست دین ہی کا ایک جزو ہے اس لئے جو لوگ مساجد کے متولی ہو سکتے ہیں انہی کو شرعاً یہ حق

پہنچتا ہے کہ وہ زمامِ قیادت کو سنبھالیں ملک و ملت کے مسائل کو کتاب و سنت کی روشنی میں حل کریں۔ اور نظم و نسق کی مشینری کو ہدایت الٰہی کے مطابق مستحکم و منضبط بنائیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اسلام کی ایک عبادت گاہ کے انتظام کو سنبھالنے کے لئے قرآن کی نگاہ میں نااہل ہوں وہ آخر ایک اسلامی حکومت کا انتظام سنبھالنے کے اہل کہاں سے ہو گئے۔ اسلامی حکومت تو ایک پورے خطۂ ارضی کو عبادت گاہ بنا دینے کے لئے قائم ہوتی ہے۔

ان آیات میں مسجد کی تولیت کی مندرجہ ذیل نشانیاں بتلائی گئی ہیں:۔

اللہ اور یوم آخرت پر ایمان، اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ۔ خدا کے سوا ہر ایک کے خوف سے خالی ہونا، جذبۂ جہاد فی سبیل اللہ۔ ساتھ ہی یہاں یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ چند سطحی اور نمائشی کاموں سے قوم کی نمائندگی اور قیادت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ قریش مکہ اسی کو بہت بڑی دینداری اور مسجد حرام کی خدمت سمجھتے تھے کہ حج کے موقع پر لوگوں کو پانی پلا دیا جائے اور مسجد کی رونق میں برہنہ بدن طوافوں اور تالیوں سیٹیوں سے اضافہ کردیا جائے۔ آج بھی قیادت کے فرائض میں چند نمائشی اور ہنگامی کام رہ گئے ہیں۔ کسی خاص دن میں غربا اور مساکین کو کھانا کھلا دینا، جلوس نکالنا اور مظاہرے کرلینا۔ افطار کے موقع پر توپیں داغ دینا کسی خاص شہر میں چلین مدت کے لئے شراب کی حرمت کا اعلان کرنا۔ اس قسم کے اعمال سے اسلام کے اصل تقاضے نہ اب پورے ہو سکتے ہیں اور نہ کبھی پہلے پورے ہوئے۔

(۱۱) وما لھم الا یعذبھم اللہ وھم یصدون	اور انہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے
عن المسجد الحرام وما کانوا اولیاءہ ان اولیاؤہ	حالانکہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس کے متولی
الا المتقون (پ الانفال آیت ۳۴)	نہیں ہو سکتے اس کے متولی تو صرف متقی ہی ہیں۔

جو لوگ تقوےٰ اور خدا ترسی سے خالی ہیں نہ وہ اللہ کے گھر کے متولی ہو سکتے ہیں! ورنہ وہ اسلامی حکومت کے محافظ اور پاسبان بن سکتے ہیں۔

خشیت الٰہی اور تقویٰ کو قیادت و انتخاب کے معیار میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اخلاص و بے غرضی

(۱۲) قال رسول اللہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امارت
صلی اللہ علیہ وسلم یا عبد الرحمٰن	(حکومت و فرمان روائی) مت طلب کرو اگر تمہیں
لا تسال الامارۃ فانک ان اعطیتہا	یہ سوال کی بنا پر ملی تو تم اس کے حوالے کر دیئے جاؤ گے

عن مسئلۃ وکلت الیھا وان اعطیتھا عن غیر مسئلۃ اعنت علیھا۔ (کتاب الاحکام بخاری مع فتح الباری مصری ج ۳ ص ۱۲۰ و صحیح مسلم ج ۲ کتاب الامارہ ص ۱۲۰)	(یعنی نصرت الٰہی شامل حال نہ ہوگی) اور اگر بغیر کسی سوال کے حکومت ملی تو خدا کی طرف سے اعانت ہوگی۔
(۱۳) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا واللہ لا نولی علیٰ ھذا العمل احد اسئلہ او احد احرص علیہ (صحیح مسلم ج ۲ کتاب الامارہ ص ۱۲۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہم بخدا یہ منصب حکومت کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتے جو اس کا طالب یا حریص ہو۔

ان روایات نے انتخاب کی نہایت واضح کسوٹی پیش کر دی ہے جو لوگ عہدہ و منصب کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں ممبری اور وزارت کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں وہ یقیناً قوم کی نمائندگی کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اور نہ کبھی کسی معاملہ میں ان پہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی روش صریحاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی ہے اور ایسوں کو منتخب کرنا یا ووٹ دینا بھی نبی صلعم کے فیصلے کو ماننے سے انکار کرنا ہے۔

اسلام میں امیدواری کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ملتا ہے وہ خلوص و دیانت حسن عمل اور صلاحیت کار کی بنا پر ملتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسی بستی ہے جہاں فساق و فجار کا مجمع ہے، صلاحیت کا رکسی میں نظر نہیں آتی اور اس بات کا صاف اندیشہ ہے کہ ان میں سے اگر کوئی اوپر آگیا تو بدی کو مزید فروغ حاصل ہوگا اور نیکی پسپا ہوتی چلی جائیگی تو ایسی صورت میں ایک صالح انسان کو اجازت ہے کہ وہ اپنا نام اور صلاحیت خود عوام اور با اثر طبقہ کے سامنے پیش کر دے، اور ان کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے فساق و فجار کو اقتدار کی مسند کی طرف بڑھنے سے روک دے لیکن یہ جنگ اور یہ مقابلہ نیکی اور بدی، حق اور باطل کے درمیان ہوگا۔ ایسے موقع پر، قومی، گروہی اور قبائلی عصبیت بھڑکانے کی قطعاً اجازت نہ ہوگی۔ اسکی تائید حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول سے ہوتی ہے۔

اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم (پ ۱۳۔ سورہ یوسف)	مجھے زمین کے خزائن پر مقرر کر دو، میں محافظ اور صاحب علم ہوں ؛

اس قسم کے مواقع پر اقتدار پرستوں کی طرف سے "ہوسِ اقتدار" اور "دوکانِ قیادت چمکانے" کے آوازے بھی کسے جاتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ جب کبھی بھی دعوتِ حق اٹھی ہے تو اس کا راستہ روکنے کیلئے پرستارانِ حکومت اور حامیانِ باطل نے اسی قسم کے ہتھکنڈے اختیار کیئے ہیں، اور حق پرستوں کو بدنام کرنے کے لئے اسی نوع کے الزام تراشے ہیں حضرت موسےٰ اور ہارون علیہما السلام کی دعوتِ حق کو ناکام بنانیکے لئے فرعون نے یہی حربہ استعمال کیا تھا۔

قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه آباءنا و	فرعونیوں نے کہا تو ہمارے پاس اسلئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ
تکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمومنین	سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اور کہ
(پ ۱۱ - سورہ یونس - آیت ۰۰)	تمہیں زمین میں بڑائی حاصل ہو جائے، اور ہم تو تمہاری بات ماننے والے نہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ صالح قیادت بھی اقتدار، بڑائی اور سربلندی کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور فاسق قیادت بھی لیکن اول الذکر کی ساری کوشش خالق ارض وسماء کے اقتدار اور اس کے قانون کی سربلندی کے لئے ہوتی ہے نہ کہ اپنی ذات یا پارٹی کے مفاد کے لئے۔ اسکے برعکس غیر صالح قیادت کی ساری جنگ ذاتی اغراض یا قبائلی اور گروہی مفاد کیلئے ہوتی ہے۔ اس نمایاں فرق کو محسوس کیئے بغیر مخلص صالح قیادت اور خود غرض فاسق قیادت کے مابین امتیاز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ صالح لوگوں کو اوپر لایا جا سکتا ہے۔ ظلم و عدوان بھری دنیا میں اگر کوئی شخص عدل و انصاف کے قیام کیلئے آگے بڑھتا ہے، اور فسق و فجور کی طاقتوں پر غالب آ کر عدل و انصاف قائم کر دیتا ہے تو ایسا شخص خدا کے ہاں ثواب سے محروم نہیں رہ سکتا۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من طلب	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مسلمانوں کا محکمہ قضا
قضاء المسلمین حتی یناله فغلب عدله جوره	طلب کیا یہاں تک کہ وہ اسمیں کامیاب ہو گیا اور اس کا انصاف
فله الجنة ومن غلب جوره عدله فله	اس کے ظلم پر غالب آ گیا تو اس کے لئے جنت ہے اور جس کا ظلم
النار (ابوداؤد کتاب القضا بلوغ الاسلام ج ۲ ص ۱۶۳)	عدل پر حاوی ہو گیا تو اس کیلئے آگ ہے۔

مذکورہ بالا تمام روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس باب میں اصل ضابطہ یہی ہے کہ عہدہ منصب کیلئے امیدواری، دوڑ دھوپ، اور جوڑ توڑ جائز نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی بعض ناگزیر اور مخصوص حالات میں صالحین کیلئے منصب پر قبضہ کرنے کی کوشش کا جواز بھی نکلتا ہے، بشرطیکہ وہ کوشش ان تمام آلائشوں اور گندگیوں سے پاک ہو جن کے آج کے عہد میں ہر امیدوار ووٹ ملوث نظر آتا ہے ؛

رسائل و مسائل

اسلامی نظام میں کفالتِ عامہ

سوال :- "ترجمان القرآن" بابت شوال ۱۳۶۸ھ کے مندرجات سے چند سوالات پیدا ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں، تصریحات فرما کر ممنون فرمائیں :-

(۱) اپنی کمائی اور وراثت میں تقسیم دولت کی مساوات خلافِ اسلام ہے۔ یہ تسلیم لیکن کیا کفالتِ عامہ کے سرکاری وظائف میں مساوات ضروری نہیں ؟

"زیادہ سے زیادہ مدت جو مساواتِ عامہ پیدا کرنے کے لئے درکار ہے وہ دس سال سے زائد ہوگی"۔۔۔۔

یہاں "مساواتِ عامہ" سے کیا مراد ہے ؟ کیا مساواتِ عامہ اسلام کا منتہائے نظر ہے ؟ حکم قرآنی یا ارشادِ نبوی یا ارشادِ صحابہ سے استنباط فرمایا جائے :-

جواب :- (۱) کفالتِ عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ریاست کو جو شخصی امدادیں نقدی یا سامانِ ضروریہ کی شکل میں دینی پڑیں گی وہ برابر نہیں ہوسکتیں۔ اسکی وجہ ظاہر ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک خاندان کا کوئی ذریعۂ آمدنی سرے سے نہیں ہے، لیکن دوسرے خاندان کو ضروریات سے کم آمدنی ہو رہی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کو ریاست کا بیت المال زیادہ وظیفہ دے گا اور مؤخر الذکر کو صرف اتنی رقم دی جائے گی جس سے اسکی کمی پوری ہو جائے۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ ایسا بھی ہوگا کہ ایک شخص محتاجِ اعانت ہے اور اس کے سر پر چھ افراد کی کفالت کا بار ہے، دوسرا درخواست دیتا ہے اور اس پر پندرہ آدمیوں کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہے، ان دونوں کو بیت المال برابر برابر کے وظائف نہیں دے گا۔ پھر یوں بھی ہوگا کہ ایک خاندان کو ریاست سال بھر تک ایک خاص ماہانہ وظیفہ دیتی ہے لیکن کسی دوسرے خاندان کو صرف دو ماہ تک ہی ایسی اعانت کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے بعد اس کے لئے ذریعۂ معاش نکل آتا ہے۔ انہی وجوہ کے پیشِ نظر میں نے اپنے مضمون میں جو بجٹ دیا ہے وہ مختلف قسم کے کنبوں کے لئے مختلف مقدار کی رقومِ وظائف کو شامل ہے۔

"مساواتِ عامہ" کی نوایجاد اصطلاح سے مراد جو اجتماعی حالت ہے وہ یہ ہے کہ :-

ا۔ لوگوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے لوازمات بہرحال عام ہو جائیں اور ان میں محرومی باقی نہ رہے،

ب۔ معاشی جدوجہد کے مواقع میں برابری پیدا ہو جائے اور ایک طبقے کے لوگ ایسے بے بس نہ ہوں کہ دوسروں کی غلامی میں معاشی زندگی بسر کریں،

ج۔ معاشی عدمِ مساوات جس حد تک تقاضائے فطرت ہے، اس سے بڑھنے نہ پائے تاکہ اخلاقی مساوات بحال رہ سکے۔

یہاں مدعا یہ نہیں کہ فرد فرد ہر لحاظ سے برابر سرابر ہو کہ نقدی، وسائل، مکان، زمین، سامان کی جتنی مقدار ایک کے پاس ہو اتنی ہی دوسرے کے پاس بھی ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ سوسائٹی کی عام فضا اتنی اصلاح پذیر ہو جائے کہ جائز فطری حدود سے بڑھی ہوئی ناہمواریاں نہ ہوں اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں پوری پبلک برابر کے حقوق پالے۔ "مساواتِ عامہ" کی یہ اصطلاح مفرد تصور پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ یہ اس حالت کا نام ہے جس کے پیدا کرنے کے لئے ایک طرف یہ حکم ہے کہ ریاست کی آمدنیاں کہیں طبقۂ امراء ہی میں گردش نہ کرتی رہیں اور کہیں یہ حکم ہے کہ اسلامی ریاست فقراء، مساکین، اور دوسرے ضرورت مندوں پر صرف کرے وغیرہ۔

قراردادِ مقاصد اور ہمارے حکمران

سوال :- (۲) قرارداد مقاصد کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے اور نہایت شرافت سے پاس کیا۔" یہ نہایت شرافت کی شرط جو لگائی گئی ہے کیا یہ طنز ہے یا حکومت کی نیک نیتی پر دال ہے؟ اگر حکومت نیک نیت نہیں تو پھر شرافت کا کیا تعلق ہے۔

قرارداد مقاصد اگر محض "بورڈ" ہے، لیبل ہے، اشتہار ہے، تو کیا اس خالی تختے کے لگنے سے اتنا انقلاب آگیا ہے کہ ہم ان انتخابات، اسمبلیوں اور اداروں میں حصہ لیں جو اس سے پہلے ممنوع و مردود تھے؟ یہ بورڈ نہ ہوتا تو اندر جاکر حالات بدلنے کی کوشش سے گریز کرنا ضروری ہوتا۔

(۲) قراردادِ مقاصد کی ماہیت کے متعلق جماعت اسلامی کی طرف سے جو بیانات اور تصریحات شائع

پذیر ہوئے ہیں، غالباً آپ نے ان کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ اگر یہ شبہ درست ہو تو اس سلسلے کی ضروری چیزوں کو بغور پڑھ لیجئے۔ یہاں مختصراً چند اشارات عرض کئے جاتے ہیں، شاید ان سے آپ کو صورتِ واقعہ کے سمجھنے میں مدد مل سکے:۔

ا۔ قراردادِ مقاصد درحقیقت ملّتِ پاکستان کا اعلان ہے جسے اس نے اپنے مقرر کئے ہوئے چند نمائندوں کے ذریعے دستوری حیثیت سے نشر کرایا ہے، تاکہ یہ آئندہ بننے والے دستور و نظام کی اساس قرار پائے۔ اس میں دیکھنا یہ نہیں کہ اعلان کرنے والے اشخاص کون تھے، اور ان کی نیتیں کیا تھیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ ملّت کیا چاہتی تھی اور اسکی نیت کیا ہے۔ اس قرارداد کے پاس ہو جانے کے بعد اب چاہے اس کے پاس کرنے والے اپنی تقریروں میں اور اپنے عمل سے اس کے ایک ایک لفظ کی تردید کرنے کی کوشش کریں، جب بھی اس کا ہر لفظ اٹل ہے، تاوقتیکہ (خدانخواستہ) ملّت خود اس سے انحراف کا فیصلہ نہ کرے۔

ب۔ جہاں تک ریاستِ پاکستان کے وجود کو پیشِ نظر رکھ کر قراردادِ مقاصد کی حیثیت متعین کرنے کا سوال ہے، اس قرارداد کی نوعیت بالکل وہی ہے جو کسی فرد کے کلمۂ طیبہ ادا کرنے کی ہوتی ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے نبی کی شریعت کی پابندی میں زندگی بسر کرنے کا وعدہ و اقرار کرتا ہے اور اس اقرار کی بنیاد پر اسے مسلمان ہونے کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ ریاست کی زبان دستور ساز اسمبلی ہوتی ہے اور اس نے بھی خدا کی حاکمیت اور اس کے نبی کی بتائی ہوئی "حدود اللہ" کی پابندی کا اقرار کر کے گویا پوری ملّت اور ریاست کی اجتماعی ہستی کی طرف سے کلمۂ طیبہ ادا کیا ہے اور اس بنیاد پر اسکو اسلامی ریاست کے سارے حقوق حاصل ہو چکے ہیں۔

ج۔ لوگوں کو کھٹک جو ہوتی ہے وہ ساری کی ساری اس وجہ سے ہے کہ ہمارے ملک کے لیڈر اور حکمران جنہوں نے ملّت و ریاست کے مقرر کردہ وکیلوں کی حیثیت سے ملّت و ریاست کی طرف سے کلمہ ادا کیا ہے، وہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ لوگ نہیں ہیں اور نہ اس کلمہ کی ادائی کے بعد ان میں کوئی تبدیلیاں آتی ہیں۔ حالانکہ ریاست ایک الگ چیز ہے اور اربابِ قیادت یا حکمران الگ چیز ہیں۔ حکمران جو قصور کریں وہ ان کے اپنے قصور ہیں اور ریاست میں اگر کوئی صفت پائی جائے تو وہ اسکی اپنی صفت ہے۔ ریاست غلط ہو جائے تو اسے درست کرنے کے لئے پورے دستوری نظام کی اصلاح کرنی پڑتی ہے اور حکمران بگڑ جائیں تو یا تو ان کو راہِ راست پہ لایا جاتا ہے یا ان کو الگ

کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جب جماعت اسلامی حکمرانوں کی اصلاح سے مایوس ہوگئی تو اس نے انقلابِ قیادت کی دعوت عام کا آغاز کر دیا اور اب وہ نئے حکمرانوں کو اوپر لانے کی جدوجہد میں مصروف ہے درحقیقت حکمرانوں اور لیڈروں کا مقام ایک ریاست کے تعلق سے بالکل وہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک عبادت گاہ کے خدام کا ہوتا ہے جنہیں اس عبادت گاہ سے تعلق رکھنے والے عوام مقرر کرتے ہیں۔ اب اگر کسی عبادت گاہ کے خدام اُس عبادت گاہ میں فسق و فجور کے ہنگامے گرم کریں، درآنحالیکہ خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس عبادت گاہ کے صدر دروازے پر "مسجد" کا بورڈ لگایا ہو تو اول تو اُن سے باز پرس کی جائیگی کہ اس بورڈ کو لگا دینے اور اس گھر کے مسجد ہونے کا اعلان کر دینے کے بعد اب تم کو حق کیا ہے کہ تم اس عبادت گاہ میں رقص و سرود کے ہنگامے بپا کرو، اب تو یہاں تم کو اقامتِ صلوٰۃ اور ذکر الٰہی اور درسِ قرآن کا انتظام کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر ان کی صلاحیتوں سے اور ان کے طرزِ عمل سے قطعی مایوسی ہو جائے تو ان کی برطرفی کا فیصلہ کرنا پڑے گا اور عوام کا فرض ہوگا کہ متفقہ فیصلے کے ساتھ ان کو ہٹا دیں اور نئے خدام فراہم کریں۔

انگریزی نظام کے تحت سرزمین ہند کی حیثیت ایک بتکدے یا ایک میکدے کی سی تھی۔ مسلمان قوم کے لیڈروں نے عوام کو دعوت دی کہ یہ سارا بتکدہ تو مسجد میں نہیں بدلا جاسکتا، آؤ اسکو تقسیم کرالیں، تاکہ ہم اپنے حصے کی عمارت کو مسجد بنا کر خدا کی عبادت کا حق ادا کر سکیں۔ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور تقسیم ہوگئی۔ ہمارے لیڈر اس تقسیم شدہ جائداد کے اس حصے کے جو پاکستان کے نام سے مسلمانوں کو ملا تھا، از خود منتظم قرار پا گئے۔ لیکن نظام کو سنبھالنے کے بعد ان حضرات نے اپنے قیامِ صلوٰۃ اور تعمیر مسجد کے وعدوں کو جب بھلانے کی کوشش کی اور متفرق قسم کے بیانات دینے لگے تو قوم میں تشویش پیدا ہوئی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی نے مطالبۂ نظام اسلامی کی تحریک کا آغاز کیا تاکہ ایک مرتبہ ان منتظمینِ پاکستان سے ایک دستوری دستاویز حاصل کر لی جائے کہ وہ جلد از جلد اسے مسجد بنائیں گے اور اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام کریں گے۔ یہ کام اللہ کے فضل سے بخوبی انجام پاگیا، جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس دستاویز کے لکھ دینے اور مسجد کا بورڈ لگا دینے کے بعد بھی بتکدہ جوں کا توں ہے اور اس میں بدستور وہی مشاغل جاری ہیں جو انگریز کے نظام کافرانہ میں جاری تھے، کسی طرح کی تطہیر کا سلسلہ شروع نہیں ہو رہا اور بار بار کی تاکید اور ایک عرصے کے صبر کے بعد جب اپنے اکابر کے متعلق یہ ثابت ہو گیا کہ یہ

تبکدے کو مسجد بنانے پر تیار بھی نہیں ہیں، اور اس میں ذکر و عبادت کو جاری کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تو مجبوراً یہی فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ خدامِ مسجد کو بدل دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ خدامِ مسجد کے فسق و فجور سے مسجد کے حقوق میں تو فرق نہیں آسکتا، وہ تو اس دن سے مسجد بن گئی جس دن اس کے مسجد ہونے اور خدا کے لیے وقف ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ پوزیشن بالکل غلط ہوگی کہ آپ اپنے اکابر سے یہ کہیں کہ تم لوگوں نے جو اعلان کیا ہے اور جو بورڈ آویزاں کیا ہے، ہم اسکو نہیں مانتے، کیونکہ تم نے بدنیتی سے یہ کام کیے ہیں۔ بخلاف اس کے کہنا یہ چاہیے کہ تم نے جب مسجد بنانے، اس میں عبادت کا انتظام کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس کے اوپر عبادت گاہ ہونے کا بورڈ لگایا ہے تو پھر یا تو اپنی ذمہ داریاں پوری کر دیا الگ ہو جاؤ کہ ہم دوسرے کارکنوں سے کام لیں۔ کتنی عجیب بات ہوگی کہ قرض خواہ کو مقروض نے جو تحریر لکھ کے دی ہو اُس کے ناقابلِ وثوق ہونے کا اعلان خود قرض خواہ کرنے لگے۔ ایسا قرض خواہ تو اپنی رقم ڈبوئے گا۔ اسی طرح ایک وقف نامے کے متعلق اگر پبلک یہ کہے کہ یہ تو بدنیتی سے لکھا گیا ہے تو وقف کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا، اسے تو زور اس پر دینا چاہیے کہ وقف نامہ لکھا ہے تو فھو المراد، لیکن براہ کرم اب اپنی تحریر کی شرائط کو پورا کر دو۔ عین اسی طرح ہمارے حکمرانوں نے قراردادِ مقاصد کو کسی بھی نیت سے پاس کیا ہو، اب تو یہ ان کے گلے کا پھندا بن چکی ہے اور اسے پکڑ کر ان کو سیدھے راستے کی طرف کھینچا جاسکتا ہے۔

(۲) یہ بات اگر ہم حکمرانوں سے کہیں کہ دیکھئے محض بورڈ لگا دینے سے تو تبکدے کا نظام مسجد کے نظام میں نہیں بدل جایا کرتا، یا محض اعلان ہی اعلان تو ایک نظامِ زندگی کو اسلامی نظامِ زندگی نہیں بنا دیتا، اس کے لئے تبدیلی کے عملی مراحل بھی طے کرنے پڑتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ بورڈ اتار دیا جائے اور اعلان واپس لے لیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب عملی ذمہ داریوں کو پورا کیجیے، ورنہ الگ ہو جائیے تاکہ اسے پورا کرنے کے لئے دوسرے لوگ کام کر سکیں۔

(۳) اب مزید ایک پہلو پر غور کیجیے۔ ایک عمارت کے مسجد ہونے کا اعلان ہوتے ہی وہ عمارت مسجد کے حقوق حاصل کرلے گی یعنی اس کے املاک کو نقصان سے بچانا، اسکی صفائی کی کوشش کرنا، اسے کسی کے شخصی قبضے میں جانے سے محفوظ رکھنا، یہ سب فرض ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس عمارت کی تطہیر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے اندر

بت بھی پڑے ہوں، تصویریں بھی کندہ ہوں، غیر اسلامی سرگرمیاں بھی جاری ہوں تو یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ اس کا نظام کار بھی عملاً نظامِ عبادت بن چکا ہے، بلکہ اس کے لئے جد و جہد کرنا فرض ہوگا۔ پھر اسی طرح اس کے منتظمین اگر اذان، اقامت، امامت، نماز، درس و تدریس اور ذکرِ الٰہی، خطبہ و وعظ وغیرہ کے انتظامات عمل میں لانے کا فرض ادا نہ کر رہے ہوں اور اس کے لئے ضروری صلاحیتیں رکھنے کا ثبوت نہ دیں تو ان کو امام، خطیب، مدرس اور مؤذن کے سے حقوق حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ ان حقوق کو دینے میں ان کی نیتوں اور عزائم اور رجحانات اور طرزِ زندگی اور قابلیتوں کو دیکھنا لازم ہوگا۔

اس فرق کو ملحوظ رکھکر غور کیجئے کہ اگر اس نئی بننے والی مسجد کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے کوئی مجلس یا کمیٹی بنے تو اس میں صالحین کا شریک ہونا اور اسے فاسقین سے پاک کرنے کی کوشش کرنا عین اسلامی فرض ہوگا یا نہیں؟ فرض کیجئے کہ اس موقعہ پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ کل اسی عمارت کے نظم و نسق کے چلانے کے لئے جو کمیٹیاں بنا کرتی تھیں، تم ان میں شریک ہونے کو حرام بتلاتے تھے، لیکن آج محض ایک اعلان اور بورڈ کے بل پر یہ حرمت حلت میں کیسے بدل رہے ہوں۔ حالانکہ معترض اس بات کو نہیں سوچ رہا کہ کل تک یہ عمارت کاملاً غیر اللہ کی ملک اور غیر اسلامی مقاصد کے لئے استعمال ہونے والی عمارت تھی اور اسکی مجلس منتظمہ نے نہ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا تھا، نہ حدود اللہ کی پابندی کا اقرار کیا تھا۔ لیکن اب اس عمارت کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر بنانے کے لئے وقف قرار دیا جا چکا ہے اور اسکی مجلس منتظمہ نے اعلان کر دیا ہے کہ اب وہ اپنا دستور العمل خدا کی نیابت اور حدود اللہ کی پابندی کے اصولوں پر بنا کر کام کریگی، اور اب سے اس کا مقصدِ وجود صرف یہ ہوگا کہ وہ پیشِ نظر عمارت کی تعمیرِ جدید کر کے اسے مسجد میں بدلے، غیر اسلامی شعائر و مناسک کو ختم کر کے اس میں اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام کرے تاکہ اس میں کما حقہٗ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

اس اعلان کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ بہت اچھا، اسلام کا قانونِ معابد یہ ہے کہ انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاخر واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ۔ اس قانون کی رو سے ہم اب مناسب منتظمین کو اس میں لائیں گے اور غلط قسم کے متولیوں سے پاک کریں گے۔

اس استعارے سے اب مدعا واضح ہو گیا۔ پہلے اسمبلیاں انگریز کے طاغوتی نظام کو چلانے کے لئے تھیں،

لیکن اب قراردادِ مقاصد نے ان کے مقصد کو بنیادی طور پر بدل دیا ہے۔ اب ان کا کام غیر اسلامی نظام کو ایک تیز رفتار تدریج سے اسلامی نظام میں بدلنا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔

(۳) بعض حضرات یہ اعتراض بھی اٹھاتے ہیں کہ عقیدہ اور مقصد کے بدلنے کا اعلان کرنے کے باوجود ابھی تک دستور العمل تو ایکٹ ۱۹۳۵ء ہی ہے۔ یہ بجا لیکن عقیدہ و مقصد کے بدلنے کا اعلان کرتے ہی سب کچھ از خود بدل نہیں جاتا، بلکہ تبدیلی کو عمل میں لانے کے لئے ایک عبوری دور طے کرنا پڑتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں عملاً تبدیل کرنے کی بھاری مہم اہل ایمان اور صالحین کے بغیر عمل میں آ سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام صالحین کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پس یہ درست نہ ہوگا کہ سٹیٹ کے عقیدہ کی تبدیلی کا اعلان ہوتے کے بعد صالحین میدانِ عمل سے الگ پڑے رہیں کہ جب تک اسلام سے پھرے ہوئے لوگ اسلامی دستور بنا کر پورا اسلامی نظام قائم نہ کر چکیں گے، اس وقت تک ہم اپنی خدمات پیش نہیں کر سکتے۔ تعمیر مسجد اور اقامتِ صلوٰۃ کے اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تو ہم تیار نہیں ہیں، البتہ یہ کام دوسرے لوگ کر دیں تو پھر امامت، خطابت، اذان اور درس وغیرہ کی ذمہ داریاں ہم سنبھال سکیں گے۔ حالانکہ پھر آپ کی ان خدمات کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

دراصل ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بھی علی حالہٖ قائم نہیں رہا، بلکہ اب اس کی ترکیب یوں ہے:-

(۱) ایکٹ ۱۹۳۵ء + (۲) انڈی پنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء + (۳) قراردادِ مقاصد ۱۹۴۹ء۔ دوسرے لفظوں میں اس ایکٹ کو بدلنے کا فیصلہ بھی اب اس کے ساتھ شامل ہو چکا ہے، یا یوں کہئے کہ اس ایکٹ کے ساتھ اس کی نفی بھی المضاعف ہے۔ پس نئے دستور کی ترتیب اور اس کے نفاذ کے دوران میں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بعض اجزا کو اضطراراً جوں کا توں استعمال کرنا پڑے گا اور بعض اجزا کی فوری ترمیمیں بذریعہ وقتی احکام (ordinances) کی جا سکیں گی۔

انڈی پنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء نے دوسری ترمیموں کے ساتھ ایکٹ ۱۹۳۵ء میں یہ اہم ترمیم بھی کر دی ہے کہ اب شاہِ برطانیہ کے لئے حلف وفاداری نہیں لیا جاتا اور وہ یہ چیز تھی جو شرک ہونے کی وجہ سے بنیادی طور پر سابق اسمبلیوں کی شرکت میں ایک مسلمان کے لئے حائل تھی۔ اب قراردادِ مقاصد نے اصل مرکزِ وفاداری یعنی حاکمیت

الٰہی کو متعین کر دیا ہے اور اب حلف کی نوعیت میں مزید تبدیلی دستور کے دوران میں لازماً ہوگی۔ اس وقت بھی حلف کا محور پاکستان کی خیر خواہی ہے اور کون مسلمان اس کا خیر خواہ نہ ہوگا۔

(ص) گھٹنے ٹیک دینے والے جس فقرے کا حوالہ آپ نے دیا ہے، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ارکانِ دستوریہ کی نیتوں کے متعلق کوئی شرط عاید کی جائے، بلکہ وہ تو صرف ایک زوردار اسلوبِ بیان ہے اور اس "مجبوری" کو ظاہر کرتا ہے جس کے تحت ہمارے نمائندوں کو ملت کا مطالبہ ماننا پڑا۔

سول لبرٹیز یونین میں شرکت کی نوعیت

سوال (۳) آپ نے سول لبرٹیز کے قیام پر زور دیا ہے۔ کیا یہ تصور اسلامی ہے؟ کیا ہم ارتداد کو بھی گوارا کریں گے؟ اس تحریک کے چلانے والے کمیونسٹ لوگ ہیں۔ کیا مصلحت کی خاطر ان لوگوں سے شرکتِ عمل اور یک محاذی جائز ہے؟

(۳) اس سوال کے جواب میں پہلے تو آپ کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ لاہور کی مرکزی سول لبرٹیز یونین سے جماعت اسلامی کے ارکان الگ ہو چکے ہیں۔

ویسے سول لبرٹیز یونین کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک غیر سیاسی جماعت ہے اور اس کی ترکیب ہر جگہ مختلف خیالات کے شہریوں سے کی گئی ہے۔ اس کے اندر کمیونسٹ خیالات کے لوگ بھی شامل ہیں، لیکن یونین اُن کی نہیں ہے۔ نہ اس کی تعمیر کمیونزم کے اصول و مقاصد پر کی گئی ہے۔ یہ شہری آزادی اور شہریت کے حقوق کے مطالبے کا ایک غیر سیاسی ادارہ ہے، جیسے تاجروں، مزدوروں اور مدرسین کی انجمنیں ان کے مختلف حقوق کی حفاظت کو لئے قائم ہوتی ہیں اور جن میں اس کا لحاظ نہیں ہوتا کہ اس کے جملہ شرکا بہر حال مسلم ہوں اور صالحین ہوں ہم نے اس مشترکہ مقصد کی غیر سیاسی انجمن میں خدا اور رسول ہی کے دیئے ہوئے ایک حق کی حفاظت کے لئے شرکت کی تھی، نہ کہ ایسے امور کے لئے جو شریعت کی حدود سے آزاد ہوں، نیز شرکت کرتے ہوئے یہ بات طے کر لی تھی اور جماعت نے بھی اس کے لئے سرکلر جاری کر دیا تھا کہ ان انجمنوں میں شرکت اسی وقت تک رہے گی جب تک کہ یہ عوام کی صحیح نمائندہ ہوں اور کسی ایک خاص عنصر کی اجارہ داری ان پر نہ ہو اور ان کو کوئی خاص جماعت

اپنے سیاسی اغراض کا آلۂ کار نہ بنا سکے اور یہ کہ ان انجمنوں کی سرگرمیاں اسلام اور ریاستِ پاکستان کے مفاد کے خلاف نہ جانے پائیں۔

ہم اس فیصلے پر نہیں گئے تھے کہ جو فیصلہ اور جو طرزِ عمل بھی اس انجمن کا ہو جائے ہم اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے، بلکہ اس فیصلے پر گئے تھے کہ جب کوئی فیصلہ یا طرزِ عمل مندرجہ بالا شرائط کی حدود سے باہر ہو جائیگا تو ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے، نیز جہاں حالات قابو سے باہر ہوتے نظر آئیں گے، ہم بلا تامل الگ ہو جائیں گے۔ چنانچہ عملاً یہی کیا گیا ہے۔

مسئلہ کشمیر اور نبی بخش صاحب نظامی

سوال:۔ (۳) امیر حکومت، حضرت مولانا نے (۱) کشمیر کے متعلق پہلے سکوت کیوں اختیار کیا۔ (۲) پشاور میں مہر سکوت توڑ کر اخبارات میں اعلان کرنے کے متعلق ممانعت کیوں نہ فرمائی۔ یہ کیوں کہا کہ اس سلسلے میں "آپ اپنے عمل کے مختار ہیں"۔ اگر سکوت اتنا ضروری تھا کہ اعلائے کلمۃ الحق سے مانع تھا تو پھر اعلان کی شدید ممانعت کیوں نہ فرمائی؟

نبی بخش نظامی کے متعلق قیاسات بے ثبوت معلوم ہوتے ہیں اور سوءِ ظن کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ سیاسی لوگ اس طرح کی باتیں کریں تو مناسب ہے جماعت اسلامی کو اس قسم کی قیاس آرائی زیبا نہیں۔ آخر حکومت نے بھی تو اس قسم کی منطق سے کام لیا اور اکابر جماعت کو قید کر رکھا ہے۔

(۳) کشمیر کے متعلق مولانا کو جو اختلاف تھا اسے اگر انہوں نے علی الاعلان کہتے پھرنے سے احتراز کیا تو اسکی وجہ یہ تھی کہ ایک داعیِ حق اقامتِ دین کے لئے جب جدوجہد کر رہا ہوتا ہے تو کام کا ایک نقشہ اور ایک اسکیم لے کے چلتا ہے اور قدم قدم پر یہ سوچتا ہے کہ کب کس اصلاح کے لئے دعوت دینے کا بہترین موقع پیدا ہوتا ہے اور کب کوئی چیز مقدم ہے اور کب کسی امر سے اصلاح کے بجائے فتنہ پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ اسی کو حکمتِ دین کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر چیز بر وقت علی الاعلان کہی جائے۔

مولانا کے پیشِ نظر یہ حقیقت تھی کہ مطالبہ کی تحریک سے نظامِ زندگی کی جس کلی اصلاح کے لئے وہ جدوجہد کر رہے تھے، اس کے دوران میں اگر مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنے اجتہادی اختلاف کو انہوں نے پیش کر کے ایک جزئی معاملے

پر توجہ صرف کی تو کلی اصلاح کے پروگرام کو ضعف پہنچ سکتا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے سکوت اختیار کیا۔ لیکن جب ان سے مسئلہ پوچھا گیا اور باصرار پوچھا گیا تو کتاب اللہ کے ایک عالم کی ذمہ داری کے پیشِ نظر انہوں نے اپنی رائے ظاہر کر دی اور یہی انہیں کرنا چاہیئے تھا۔

پشاور میں جب سائل صاحب نے ان سے کہا کہ میں تو اس بات کو شائع کراؤنگا تو مولانا نے ان کو اس حرکت سے باز رہنے کے لئے یہ کہا کہ اس حرکت سے تم جتنا نقصان مجھے پہنچانا چاہتے ہو، اس سے زیادہ نقصان تم جہادِ کشمیر کو پہنچاؤ گے۔ ان الفاظ سے انہوں نے سائل کو اپنی رائے کی اشاعت سے روکا اور یہ بھی کہا کہ اگر اسے شائع کرانا ہوتا تو میں خود ہی اس کا انتظام کر چکا ہوتا۔ لیکن سائل صاحب نے باصرار کہا کہ نہیں میں تو شائع کراؤنگا۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ آپ اپنے عمل کے مختار ہیں، یعنی اگر معاملہ میری اجازت سے متعلق ہے تو میں تو روک رہا ہوں، لیکن اگر آپکو اجازت کے بغیر کرنا ہی ہے تو اب آپ کو اس کا اختیار تو حاصل ہو ہی چکا ہے! اس فقرے کے معنی اجازت کے نہیں ہوتے، بلکہ سمجھانے کے بعد خاتمہ کلام کے لئے جب یہ الفاظ کہے جاتے ہیں تو مفہوم یہی ہوتا ہے کہ اجازت کے بغیر اگر کوئی اقدام کرنا ہی ہے تو پھر کون روک سکتا ہے۔ آپ خود بھی سوچیئے کہ مولانا سائل صاحب پر جبر کیسے کر سکتے تھے۔ بے بسی تھی!

کسی شخص کا نام ہماری طرف سے اگر شائع ہوا ہے تو وہ اس طرح نہیں ہوا کہ اسکے بارے میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے قیاس آرائی کر لی گئی ہے کہ یہ صاحب نبی بخش نظامی ہونگے جو ان دنوں آزاد کشمیر گورنمنٹ کے پروپیگنڈہ سکرٹری تھے۔ اگر یہ قیاس آرائی ہی کرنی ہوتی تو کیوں نہ وزیر اعظم پاکستان کا نام دے دیا جاتا۔ درحقیقت نام کو شائع کرنے سے قبل پوری طرح تحقیق کر لی گئی تھی۔ اوّل تو خود اس صحبت ہی میں ان سائل صاحب کا تعارف کرایا گیا تھا، لیکن مولانا نام بھول گئے تھے۔ اس کے بعد پشاور کی جماعت کے ارکان کی معرفت باقاعدہ تحقیقات کی گئی اور جب ساری تفصیلات بہم پہنچ گئیں تو اس وقت یہ نام برسرِ عام رکھا گیا۔ اس نام اور عہدے کے متعلق تحقیقات آج نہیں، بلکہ بہت پہلے کر لی گئی تھی، چنانچہ مولانا کے اس سے قبل کے بیانوں میں اس کا ذکر اشارۃً ہوا ہے، اور خود ہم نے تقاریر میں اس کا ذکر بار بار کیا ہے۔ اب جبکہ ترجمان القرآن میں واقعہ کی تاریخ بیان کی گئی تو زیادہ صاف صاف طریق سے حوالہ دے دیا گیا۔

اگر نبی بخش نظامی صاحب اس سے انکار کریں تو پھر واقعی ہمارے ذمے ہوگا کہ ہم شہادتیں بہم پہنچا دیں۔ آخر ایک شخص کے متعلق کھلم کھلا پریس میں ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے تو اسکے لئے تو موقع ہے اگر واقعہ کا تعلق اس سے نہیں ہے تو وہ انکار کرے۔

اشارات کا بقیہ

(صفحہ ۲۹۲ سے آگے)

اگر ہر رفیق اس معاہدے کو ذہن میں تازہ رکھے جو اس نے جماعت سے تعلق قائم کرتے ہوئے اپنے اللہ سے مومنین کو گواہ بناکر استوار کیا ہے تو اس کا یہ احساس ذمہ داری زندہ رہ سکتا ہے۔ اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر رفیق یہ بات پیشِ نظر رکھے کہ جماعت اسلامی کا نظم اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ایک امانت ہے جس پر وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح نگران اور پہرہ دار بنایا گیا ہے۔ یہ وہ قیمتی امانت ہے جسے وجود میں لانے کے لئے تاریخ کے ہزارہا عوامل کام کرتے رہے ہیں اور وہ امانت ہے جس پر بہت سے دماغوں کی محنت، بہت سارو پیہ، بہت سی شب بیداریاں، بہت سی دوڑ دھوپ، بہت سی قربانیاں صرف کی جاچکی ہیں اور جسے نشوونما دینے میں بہت سے بندگانِ خدا نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ اس نظم میں اگر کوئی قوت ضعف لانے کی کوشش کرے تو اسکی دست برد سے اس امانت کو بچانا ہر رفیق کا اوّلیں فرض ہے۔ جو لوگ اس فرض میں کوتاہی کریں وہ اُس پہرے دار کی طرح ہیں جو اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں خیانت سے کام لیتا ہے۔

پس رفقا کو ایک ایسی فضا بنا دینی چاہیئے اور ایسی روایات قائم کرنے میں مسلسل مصروف رہنا چاہیئے کہ جس میں نظم جماعت پر اثر انداز ہونے والا کوئی مفسدہ سر نہ اٹھا سکے اور اگر کوئی نامطلوب چیز ابھرے تو وہ جہاں اُبھرے وہیں اسکو خوش اسلوبی سے دبا دیا جائے۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس کے ہوتے ہوئے اہلِ امر اور مامورین دونوں اپنی اپنی حدود میں کتاب وسنت کے مطالبات کے مطابق چل سکتے ہیں۔

---

(۶) امر و طاعت کا نظم اسلام کے تقاضوں کے مطابق صرف ایسی جماعتی فضا میں چل سکتا ہے جس میں افراد کے باہمی تعلقات صحیح اخلاقی بنیادوں پر استوار ہوں۔ ان اخلاقی بنیادوں کو خدا اور رسول نے ٹھیک ٹھیک متعین کر دیا ہے۔ خصوصیت سے سورۂ حجرات میں وہ اہم اصول مختصراً یکجا بیان کر دیئے گئے ہیں جو

اسلامی سوسائٹی اور اسلامی جماعت کے ارکان کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ یہاں بالاجمال ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(ا) مجلسی زندگی کو درست رکھنے کے لیئے پہلا حکم یہ ہے :-

یایھا الذین اٰمنوا ان جآءکم فاسقٌ	اے اہل ایمان! اگر کوئی فاسق تم تک کسی خبر
بنبإ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالۃ	کو لائے تو اس کے بارے میں (فیصلہ کرنے سے قبل)
فتصبحوا علی ما فعلتم ندمین	تحقیق کر لو تاکہ تم کسی گروہ پر نادانی میں (مشتعل ہو کر)
	نہ ٹوٹ پڑو اور پھر بعد میں اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

کسی اہم قسم کی خبر، اطلاع یا بیان کے سننے پر فوراً اس کے حق ہونے کا فیصلہ کر لینا بسا اوقات غلط نتائج تک پہنچاتا ہے اور اس قسم کی غلطی پر آخر کار پشیمانی ہوتی ہے۔ یہ ہدایت عام ہے، لیکن ایک اسلامی سوسائٹی میں رفقا کو باہم اس پر سختی سے کاربند ہونا چاہیئے اور ایک دوسرے کے متعلق فساق کی لائی ہوئی اطلاعات پر فوراً فیصلے نہیں کر لینے چاہئیں۔ آئندہ انتخابات میں جب شیاطین جن وانس کی تگ ودو عام ہوگی، اس وقت تو اس ہدایت سے ایک لمحہ کے لیئے نگاہ کو ہٹنے نہ دینا ہی لغزشوں سے بچا سکے گا۔

(ب) انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا	اہل ایمان باہم ایک دوسرے کے لیے بھائی بھائی
بین اخویکم	ہیں، پس اپنے بھائیوں کے درمیان مصالحت کراؤ۔

اس حکم کا منشا ظاہر ہے۔ ایک مسلم سوسائٹی کے ارکان میں اگر کبھی بتقاضائے بشریت رنجش، کدورت یا جھگڑا پیدا ہو تو دوسرے رفقا کا کام یہ نہیں کہ وہ فتنہ کی آگ کو ہوا دینے میں لگ جائیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ وہ بدگمانیوں کو دور کرنے، دلوں کو قریب کرنے، اشتعال کو رفع کرنے کی کوشش کریں، یہاں تک کہ اخوت کا وہ تعلق بحال ہو جائے جس کے بغیر کسی اسلامی جماعت کا نظم مضبوط نہیں ہو سکتا۔

آئندہ انتخابات کے ہنگاموں میں جماعت اسلامی کو اس ہدایت کے مطابق اپنا مصالحانہ طرز عمل لے کے میدان میں آنا ہوگا، جب مختلف عناصر مسلم افراد اور مسلم برادریوں اور مسلم جماعتوں کو لڑانے کی کوششیں کر رہے ہوں تو اس وقت جماعت اسلامی یہ پارٹ ادا کرے کہ وہ پوری ملت کو مصالحت کا درس دے، عصبیتوں کی آگ کو ٹھنڈا کرے، اور حبل اللہ پر جمع ہونے اور انتخابات میں اسلامی اصولوں پر کاربند ہونے کی دعوت دے۔

(ج) یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منہم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منہن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولئک ہم الظالمون۔

اے اہل ایمان! تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں بہتر لوگ ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں بہتر خواتین ہوں۔ اور باہم ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو، اور ایک دوسرے کے توہین آمیز نام نہ دھرو، ایمان لانے کے بعد گنہ گارانہ نام دھرنا بہت برا ہے۔ اور جو کوئی (ان حرکات سے) توبہ نہ کرے تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔

اس ارشاد کے ذریعے باہم تمسخر کرنے، عیب چینی کرنے اور تذلیل آمیز نام دھرنے سے روکا گیا ہے اور انتباہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان عادتوں سے باز نہ آئیں ان کا مقام مومنین صالحین کی صف میں نہیں، ظالمین کی قطار میں ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ایک سوسائٹی کے نظام کے لئے دیمک کا سا کام کرتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی زیادتیوں سے باہم دل پھٹ جاتے ہیں۔ جس جماعت میں طنز و تعریض، پھبتی اور تمسخر، تذلیل و توہین وغیرہ مفاسد پھوٹ نکلتے ہیں وہ کبھی بھی وحدت و اخوت کے معیار پر قائم نہیں رہ سکتی۔ جماعت اسلامی کے ہر کارکن کو ان مفاسد سے پوری طرح پاک ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

انتخابات کے ہنگامے میں آپ کو قدم قدم پر ان مفاسد کا سامنا کرنا پڑے گا اور آپ کا جی چاہے گا کہ آپ بھی مزے لے لے کر دوسروں کا تمسخر اڑائیں، دوسروں کے عیب ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیان کریں، ان کے نام دھریں اور ان پر فقرے چست کریں، لیکن اگر مذکورہ بالا آیت نگاہوں کے سامنے رہے گی تو ان شاء اللہ ظالمین کے صف میں جا کھڑے ہونے سے بچ سکیں گے۔

(د) یا ایہا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم

اے اہل ایمان بہت زیادہ تہمتیں لگانے کی عادت سے باز آجاؤ، کیونکہ یقیناً بہت سی

ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضاً ايحب احدكم ان ياكل لحم اخيه ميتاً فكرهتموه واتقوا الله ان الله تواب رحيم

تہمتیں گناہ ہوتی ہیں، اور تجسس نہ کرو، اور کسی کی غیر حاضری میں بدگوئی نہ کرو؛ کیا تم میں سے کوئی اسے پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کے مردار گوشت کو کھائے نہیں بلکہ اس سے تم کو گھن آتی ہے۔ اور اللہ سے ڈرو یقیناً وہ توبہ کرنے والوں کو معاف کرنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ باہم بدگمانیاں نہ کیجائیں، شکوک اور شبہات کی فصل دلوں میں نہ اگائی جائے، اور تہمتیں نہ تراشی جائیں اور نہ ادھر ادھر سے سن کر کسی تہمت کو بیان کیا جائے، کیونکہ ہر وہ شبہ یا تہمت جو درحقیقت بے بنیاد ہو ایک معصیت ہے۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ باہم تجسس نہ کیا جائے۔ تجسس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے عیب ڈھونڈنے میں پڑے رہیں یا ہر طرف رازدارانہ باتوں کو سونگھتے پھریں یا مختلف مجالس کی سن گن رکھنے میں سرگرم رہیں۔ یہ انتہائی معیوب اور نظم کے لئے تباہ کن حرکات ہیں۔ تیسرا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کی غیر حاضری میں اسکی برائیاں بیان کر کے مزے نہ لئے جائیں، کیونکہ یہ فعل اتنا ہی گھناؤنا ہے جتنا یہ کہ آدمی جس کی غیبت کر رہا ہو اسکی بوٹیاں نوچ نوچ کے کھائے۔ ان تقاضوں کو جتنا زیادہ پیشِ نظر رکھا جائے گا جماعت کی وحدت اور رفقا کی اخوت اتنی ہی مستحکم ہوگی اور نظم امر و طاعت ٹھیک طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔

انتخابات کے دوران میں اس آیت کے ہر مطالبے کو لوگ پامال کرتے نظر آئیں گے۔ اور نہ معلوم کن کن مسلمانوں کا گوشت بھرے جلسوں میں مزے لے لے کر کھایا جائے گا۔ لیکن جماعت اسلامی کے کارکنوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کے تقاضوں کو ہر لمحہ پیشِ نظر رکھیں اور اللہ سے ڈرتے ہوئے ان اخلاقی امراض سے اپنے آپکو بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کریں۔

سورۂ حجرات میں کچھ اور مضامین بھی ہیں جن کا تعلق جماعتی اخلاق سے ہے۔ جو لوگ چاہیں اس کے مضامین پر بطور خود غور کریں۔ یہاں صرف چند نمایاں ترین اخلاقی تقاضوں کو درج کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ اگر ہم تعلق باللہ کے اہتمام، نظم جماعت کی پاسداری اور مذکورہ بالا مجلسی اخلاقیات کی پوری پابندی کے ساتھ انتخابات کے میدان میں اترے تو پھر انشاء اللہ ناکامی کا ذرہ بھی خدشہ نہیں ہو سکتا۔ خدا اگر ہمیں ان تین تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق دے تو یقین کر لیجئے کہ آپ کی پونجی جسے آپ گردش میں لا رہے ہیں، کئی گنا منافع لے کے لوٹے گی ــــ لیکن اگر خدانخواستہ اپنی ان بنیادی ضروریات سے ہم نے تغافل کیا تو پھر چاہے آپ اسمبلیوں کی پوری سیٹیں جیت لیجائیں تو بھی ٹوٹا رہیگا! خدا ہمیں اس حقیقی خسارے سے بچائے! حسبنا اللہ ربنا نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

"ناظرین ترجمان القرآن"

کے لئے

خوش خبری

"ترجمان القرآن" کے تمام ناظرین یہ خبر سن کر بہت خوش ہونگے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے ملتان جیل سے "تفہیم القرآن" کو نظر ثانی کے بعد مرتب کر کے بھیج دیا ہے۔ یہ کتاب فی الحال دو جلدوں میں ہوگی۔ پہلی جلد سورۃ الفاتحہ سے سورۃ المائدہ تک مع دیباچہ اور مقدمہ کے ہوگی اور دوسری جلد سورۃ الانعام سے سورۂ یوسف تک۔ تفہیم القرآن کا مسودہ شیخ قمر الدین صاحب، پبلشر، اندرون موچی دروازہ لاہور کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جو اسے دیدہ زیب بنا کر شائع کریں گے۔

اس کے علاوہ مولانا محترم نے اپنی کتاب "سود" کو مکمل کرنے کے لئے کچھ مضامین ارسال فرمائے ہیں۔ جو ترجمان القرآن کی اس اشاعت سے شائع کرنے شروع کر دئے گئے ہیں۔ اور اس کے علاوہ "سود" میں بھی شامل کئے جائیں گے۔

مینیجر

ترجمان القرآن

۵۔ اے۔ ذیلدار پارک۔ اچھرہ

لاہور

سرورق مطبوعہ ریپن پریس، لاہور

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۳ | ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۹ء | عدد ۵

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔